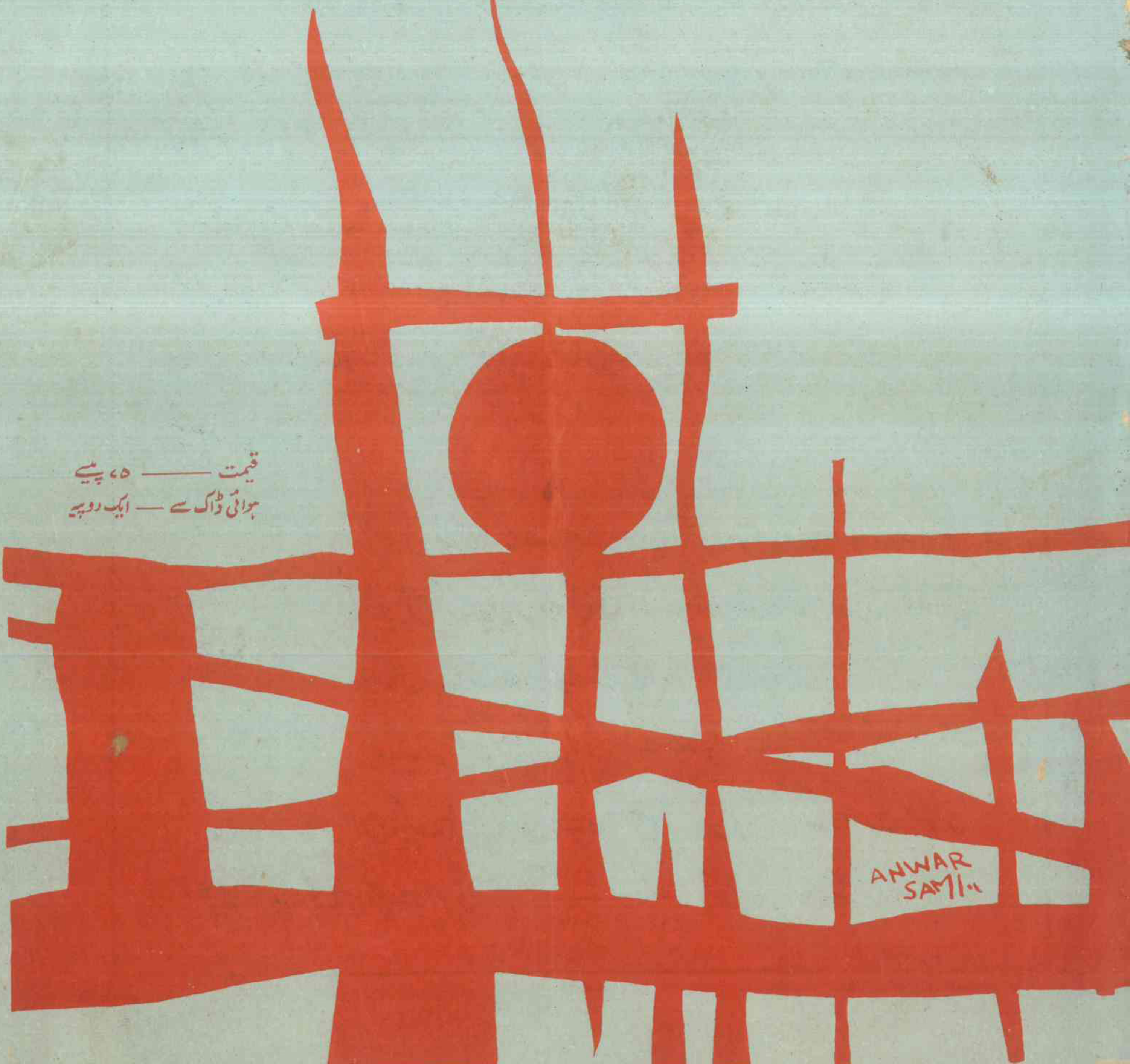
ہفت روزہ
الفتح
کراچی

۱۹-۲۶ اپریل ۱۹۷۳ء

- انہوں نے بھرے ایوان میں پیر صاحب کی شلوار کھول دی
- غلام محمد سے ایوب خان تک - سیاسی سازشیں
- اراکینِ اسمبلی کے نام دولتانہ کا خفیہ خط
- کھوڑو اور راشدی عوام کی عدالت میں



قیمت —— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے —— ایک روپیہ

اپیل

الفتح، آپ کا پرچہ ہے ۔عوام کی آواز ہے ۔

اس کے نیوز پرنٹ کا کوٹہ محدود کیا جا چکا ہے، اشتہارات پر پابندی لگادی گئی ہے ۔ضرورت پوری کرنے کے لئے ۵۸ روپے رِم کے حساب سے کاغذ خریدنا پڑتا ہے ۔جبکہ سرکاری طور پر کاغذ ۱۹ روپے بیس پیسے رم کے حساب سے ملتا ہے ۔ہمیں اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کیلئے آپ کے تعاون کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے، آپ اس کے سالانہ خریدار بنیئے اور اپنے دوستوں کو بھی بنائیے۔ہم نے سالانہ خریداروں کو ایک تہائی سے زیادہ کی رعایت دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے ۔

الفتح کی سالانہ قیمت ۳۹ روپے بنتی ہے، آپ ۲۵ روپے کا منی آرڈر بھیج کر ۱۴ روپے کی بچت کر کے سالانہ خریدار بن سکتے ہیں ۔

دو سال کیلئے ۷۸ روپے کی بجائے ۴۵ روپے ۔

تین سال کیلئے ۱۱۷ روپے کی بجائے ۷۰ روپے ارسال کر کے مستقل خریدار بن جائیے ۔

اس طرح ایک طرف آپ اپنے الفتح کی مدد فرمائیں گے اور دوسری طرف آپ کو بھی بچت ہوگی ــــــــ آج ہی سالانہ خریدار بنیئے ۔

خداکی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

مدیر
وہاب صدّیقی

۱۹-۲۶ مارچ ۱۹۷۳ء

قیمت: ——— ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے: ——— ایک روپیہ

جلد:- ۳ شمارہ:- ۴۹

ادارئیے

اصل کام باقی ہے

آئین بن گیا، اچھا ہوا۔ سیاست دانوں نے بیانات اور ہتھکنڈی چالوں کے ذریعے غیر یقینی حالات پیدا کر دیئے تھے۔ زور آزمائی کے بھرپور مظاہرے کئے گئے۔ معاہدے ہوتے رہے اور ٹوٹتے رہے۔ وہ لوگ جو ایک وقت محب الوطن قرار پاتے تھے، دوسری سانس میں ملک دشمن غیر ملکی ایجنٹ اور عوام دشمن بن جاتے تھے۔ معاملات مرضی کے مطابق رخ اختیار کرتے تو حکومت اور اسکے سربراہ کی فراخدلی، سیاسی فراست اور تدبر کے گن گائے جاتے اور جب یہ محسوس ہوتا کہ جو کچھ طے پایا تھا، اُس میں انہیں کچھ نہیں ملے گا تو چھینک کے بہانے اسمبلی کے بائیکاٹ کی نوبت پہنچ جاتی۔ حکومت کے آمرانہ روّیے کی شکایت کی جاتی۔ آئین کو غیر اسلامی، غیر جمہوری اور وفاق کے تقاضوں کے منافی گردانا جاتا۔ عوامی تحریک چلانے کی دھمکیاں دی جاتیں۔ اچانک کچھ لو اور کچھ دو کا سلسلہ شروع ہوتا تو مصالحت کی راہ نکل آتی اور وُہ آئین جو غیر اسلامی، غیر جمہوری اور متعدد خامیوں کا پلندہ تھا، اس کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے اور پھر دونوں طرف سے یہ سُنائی دیتا کہ حکومت نے بڑی فراخدلی کا مظاہرہ کیا ہے، حزب اختلاف کا جذبۂ افہام و تفہیم قابلِ قدر ہے۔ آئندہ بھی اس جذبے کے تحت کام ہونا چاہیئے۔

آئین کی تیاری میں ایک بات پایۂ ثبوت تک پہنچ گئی کہ حزبِ اختلاف کو ہر محاذ پر منہ کی کھانا پڑی ہے۔ صدر بھٹو نے انہیں وہ قلا بازیاں کھلائی ہیں کہ ان کی قلعی کھُل گئی ہے۔ دراصل حزبِ اختلاف کی مخالفت کسی بھی طرح اصولی نہ تھی۔ انہیں عوام کی نہ پہلے حمایت حاصل تھی اور نہ اب ہے اور نہ ہوگی۔ ان کا طبقاتی کردار متقاضی تھا کہ وہ برسرِ اقتدار طبقے سے اقتدار میں شرکت مانگیں یا کم از کم اپنے وجود کا احساس دلائیں۔ وُہ محروم تھے لہٰذا کچھ لینے کا مطالبہ

خاص مضامین

سرورق: انور سمیع

فون: ۴۱۲۲۷۴

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح ۸۰ ڈی۔ نرسری کمرشیل ایریا (پی۔ای۔سی۔ایچ۔ایس) کراچی ۲۹ سے شائع کیا

کرتے ہوئے دکھائی دیئے اور جب ان کے سامنے ہڈی ڈالی گئی تو وہ دُم ہلاکر ساتھ مل گئے۔

حزبِ اختلاف کے مطالبات اصولی ہوتے تو وہ کسی صورت میں پسپا نہ ہوتے۔ چونکہ ان کی بنیاد ذاتی اور طبقاتی تھی لہٰذا وہ دم دبا کر اسمبلی کے اندر چلے گئے اور آئین کی دستاویز پر دستخط کر دیئے۔ حزبِ اختلاف جن ترمیمات کی منظوری کا راگ الاپ رہی ہے، برسرِ اقتدار جماعت انہیں پہلے ہی منظور کر چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا مقصد دھونس جمانا تھا جس میں انہیں نہ صرف اسمبلی میں ناکامی ہوئی بلکہ عوام کا وہ حصّہ جو پیپلز پارٹی کے ڈیڑھ سالہ دورِ حکومت میں بعض غلط پالیسیوں، مزدوروں کے خلاف کارروائیوں رشوت میں اضافے اور مہنگائی کی وجہ سے متحدہ جمہوری محاذ سے ہمدردی کرنے لگا تھا اُسے بھی مایوسی ہوئی اور اس پر یہ واضح ہوگیا کہ یہ صرف اقتدار کی لڑائی تھی۔

آئین کی منظوری کے بعد پیپلز پارٹی کو سیاسی محاذ پر سب سے بڑی کامیابی ہوئی ہے۔ حزبِ اختلاف کی غلط حکمتِ عملی اور سیاسی دیو الیے پن نے اس پارٹی کو ایک سنہری موقع فراہم کیا ہے عام آدمی کی سوچ میں جو تبدیلی رونما ہوئی ہے، اس نے جماعت کے لئے فی الحال گنجائش پیدا کر دی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اس سے کس حد تک فائدہ اٹھاتی ہے یا پھر عوام دوبارہ غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

پیپلز پارٹی نے جب عنانِ اقتدار سنبھالی تو بلاشبہ ملک گوناگوں مسائل سے دوچار تھا اور آج بھی بہت سے اہم مسائل حل طلب ہیں۔ پاکستان سے متعلق بین الاقوامی دو بڑی طاقتوں کا رویہ کسی طور بھی قابلِ تعریف نہیں رہا۔ اندرونی سطح پر بھی حالات بگاڑنے کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ ایک شکست خوردہ قوم، معاشی طور پر مکمل دیوالیے کا شکار ملک پیپلز پارٹی کو ملا تھا۔ ان حالات میں ضروری تھا کہ وہ لوگ جو اہم مسائل کو سلجھانے میں مصروف تھے۔ اُن کی مدد کے لئے پارٹی اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پارٹی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا اور وہ لوگ جو کل تک اس جماعت کے صفِ اوّل کے دشمن تھے انہیں پارٹی کے اہم عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ ان میں زیادہ تر کنونشن لیگی تھی۔ بدقسمتی سے انہی میں سے بعضوں کو وزارت تک سونپ دی گئی۔ انہوں نے ہر وہ کام کیا جو اس جماعت کے منشور کے منافی تھا۔ دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹا۔ اپنے مخالفین کو انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا بنیادی کارکنوں کو نظر انداز کر کے اُن لوگوں کو سامنے لایا گیا جو ایوب آمریت کے بدنام ترین افراد میں سے تھے۔

وزیروں کی اکثریت نے بیوروکریسی پر تکیہ کیا۔ مزدوروں کی تحریک کو دبانے کے لئے سابقہ حکومتوں کے مقابلے میں سخت اقدامات کئے۔ کسانوں کی بیدخلیاں ہوئیں۔ من مانی کارروائیاں کی گئیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس حکومت سے جو امیدیں وابستہ کئے ہوئے تھے، ان پر پانی پھر گیا۔ ایماندار اور دیانت دار کارکن یا تو خاموش ہو کر بیٹھ گئے یا پھر جس کسی نے آواز اٹھائی اس پر جیلوں کے دروازے کھول دیئے گئے۔

اس عمل نے پارٹی کی تنظیم کو منتشر کر کے رکھ دیا۔ دفتروں میں تیزی سے تالے پڑنے لگے۔ عوام کے اتحاد کو شدید دھچکا پہنچا۔ جو سیاسی کارکن بورژوا طرزِ حکومت سے واقف تھے یا ہیں، انہیں اس کا بخوبی احساس تھا کہ جس سیاسی جماعت کا تنظیمی ڈھانچہ انتشار کا شکار ہو جائے، اس کی ہائی کمان کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی ہائی کمان کو ورثے میں جو مشکلات اور مسائل ملے تھے، ان میں کمی کی بجائے اضافہ ہو گیا۔ ایک طرف اس ہائی کمان کو اپنے جاگیر دار ارکانِ اسمبلی کو قابو میں رکھنا تھا اور دوسری طرف ان جاگیرداروں کی جانب سے جو پارٹی دشمن کارروائیاں ہو رہی تھیں، ان سے نپٹنا تھا اس صورت میں عوام کو اطمینان کا سانس نصیب نہ ہو سکا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان جاگیرداروں اور ارکانِ اسمبلی کی مدد سے ایک آئین بن گیا جس سے وقتی طور پر غیر یقینی حالات کے خاتمے میں مدد ملی ہے۔

پیپلز پارٹی کو ملک کے عوام کو اس صورتِ حال سے ہمیشہ کے لئے نکالنا ہے تو وہ فوراً مزدوروں اور کسانوں سے کئے گئے وعدوں کو پورا کرے۔ آئین کے نفاذ میں غیر معمولی تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔ جتنا جلد ممکن ہو سکے آئین کے نفاذ کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کے بعد عام انتخابات کرائے جائیں۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے۔ کہ اب پیپلز پارٹی کو جاگیرداروں کی ضرورت نہیں۔ عوام کسی صورت میں جاگیرداروں کو منتخب کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اس جماعت کا اپنا بھی مفاد یہی ہے کہ وہ عام انتخابات کے ذریعے اپنی صفوں میں مکمل سرجری کرے۔ وہ ارکانِ اسمبلی یا وزراء جنہوں نے دونوں ہاتھوں سے روپیہ سمیٹا ہے، بدعنوانیوں کے مرتکب ہوئے ہیں، مزدوروں کے قتل عام کے ذمہ دار ہیں، ان سے نجات حاصل کی جائے اور کھلی عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں۔ ان موقع پرستوں کو پارٹی کے کلیدی عہدوں سے بلا تاخیر الگ کر دیا جائے جو انتخابات کے بعد پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

صدر بھٹو وزیروں کی سرجری کرینگے

فضل الٰہی چودھری یا شیخ رشید پاکستان کے نئے صدر ہونگے؟

واقف حال

نیا آئین بن چکا ہے۔ ۱۲ اپریل کو صدرِ پاکستان نے اس کی توثیق بھی کر دی ہے۔ سینٹ کے انتخابات کے لئے قانون کی تیاری کا کام شروع ہو چکا ہے۔ مرکزی وزیرِ قانون اور پارلیمانی امور عبدالحفیظ پیرزادہ نے یقین دلایا ہے کہ اس قانون کی تیاری میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ دس پندرہ دن میں مسودۂ قانون تیار کر لیا جائے گا۔ انہوں نے کہا ہے کہ نیا آئین پارلیمان کے مکمل ہونے کے بعد نافذ کیا جائے گا، اور آئندہ سال کا مالی بجٹ عبوری آئین کے تحت منظور کیا جائیگا۔ اس بیان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ سینٹ کے انتخابات جولائی کے اوائل میں ہوں گے۔ اور اس کے آخری عشرہ تک نیا آئین نافذ کر دیا جائے گا۔

ان دنوں پاکستان پیپلز پارٹی کی مرکزی قیادت حکومتی عہدوں مرکزی اور صوبائی وزارتوں میں ہمہ گیر تبدیلیاں کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ نئے آئین کے نفاذ کے بعد صدر بھٹو وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالیں گے، صدر بھی پاکستان پیپلز پارٹی کا ہوگا۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ صدر پنجاب سے لیا جائیگا۔ اس سلسلے میں قومی اسمبلی کے اسپیکر چوہدری فضل الٰہی اور ایوان کے ڈپٹی لیڈر شیخ رشید کے نام سامنے آئے ہیں۔ تاہم چوہدری فضل الٰہی کا نام سرِفہرست ہے۔

مرکزی کابینہ کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو ہوں گے۔ ان کی کابینہ میں عبدالحفیظ پیرزادہ، غلام مصطفےٰ کھر، ممتاز بھٹو اور معراج خالد کی شمولیت یقینی ہے۔ حفیظ پیرزادہ بدستور قانون اور پارلیمانی امور کے وزیر رہیں گے۔ معراج خالد کو وزارتِ تعلیم سونپی جائے گی۔ اور مصطفےٰ کھر وزیرِ داخلہ ہوں گے۔ اور اس بات کے قوی امکانات ہیں کہ مولانا کوثر نیازی کو اس کابینہ میں نہیں لیا جائے گا۔ ان کے اخراج کا فیصلہ پیپلز پارٹی کے کارکنوں اور عوام کے مطالبہ پر کیا گیا ہے۔ کیونکہ مولانا موصوف نے پیپلز پارٹی کو شدید نقصان پہنچایا ہے، اور اپنی وزارت سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اپنی پبلسٹی کرائی۔ اس کے علاوہ اس سال حاجیوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

سندھ کی کابینہ میں بھی وسیع پیمانے پر ردوبدل ہوگا۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ غلام مصطفےٰ جتوئی یا سید قائم علی شاہ ہوں گے۔ غلام مصطفےٰ جتوئی کا نام سرِفہرست ہے۔

آئین سازی کے دوران حزبِ اختلاف اور اس کے متحدہ جمہوری محاذ نے متعدد قلابازیاں کھائیں، گرگٹ کی طرح رنگ بدلا۔ آئین سازی میں تعطل ڈالنے کے لئے کبھی آئینی سمجھوتے سے اختلاف کیا، تو کبھی اسمبلی کا بائیکاٹ، آخر میں تحریک چلانے کی دھمکی دی اور صدر بھٹو کی یادداشت بھی مسترد کر دی۔ آخر وقت تک وہ اس خوش فہمی کا شکار رہی کہ اسے عوام کی حمایت حاصل ہے۔ لیکن عوام نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ اور جب حزبِ اختلاف نے دیکھا کہ آئین مکمل ہو چکا ہے، آئین ساز اسمبلی اس کی منظوری دینے والی ہے تو وہ انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہونے کے لئے آئین ساز اسمبلی کے آخری اجلاس میں شامل ہو گئی۔ اس سے عوام نے یہ تاثر لیا کہ حزبِ اختلاف اور حزبِ اقتدار کے درمیان ہونے والی لڑائیاں، مصنوعی لڑائیاں تھیں۔ بالفاظ دیگر یہ "نورا کشتی" تھی، کیونکہ اگر موجودہ آئین حزبِ اختلاف کے نزدیک "غیر اسلامی، آمرانہ، غیر وفاقی" تھا تو چند گھنٹوں میں "اسلامی، جمہوری اور وفاقی" کیسے بن گیا۔ اس نورا کشتی میں سب سے زیادہ نقصان نیشنل عوامی پارٹی کو اٹھانا پڑا۔ نیپ سوشلزم اور سیکولرازم کی حامی تھی، لیکن ہوسِ اقتدار میں اندھی ہو کر وہ اپنے اصولوں سے ہٹ گئی۔ اور رجعت پسند اور مذہبی جماعتوں سے اتحاد کیا۔ اس اتحاد نے اس کا حقیقی کردار بالکل واضح کر دیا۔ گو ابھی تک نام نہاد متحدہ جمہوری محاذ قائم ہے۔ لیکن اب یہ بالکل بے اثر ہو چکا ہے۔

تعزیت

وفاقی انجمن صحافیان پاکستان کے صدر جناب منہاج برنا اور عوامی رہنما معراج محمد خان کی والدہ محترمہ ۱۵ اپریل ۱۹۷۳ء کو راولپنڈی میں رحلت فرما گئیں۔ ادارہ الفتح اس غم میں ان کے ساتھ برابر کا شریک ہے اور خدائے بزرگ و برتر سے دست بدعا ہے کہ پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

آئین اگست سے پہلے نافذ ہوگا

اپنی حیثیت کھو چکا ہے۔ آپس میں جوتم بیزار ہو رہی ہے۔ مولانا ظفر احمد انصاری کو متحدہ محاذ سے نکال دیا گیا ہے۔ مولانا نورانی نے آئین پر دستخط نہیں کئے ہیں۔ حالانکہ متحدہ محاذ کی دیگر تمام جماعتوں نے آئین پر دستخط کر دیئے ہیں۔ اب تاریخ میں اس کی حیثیت پی ڈی ایم اور ڈیک سے زیادہ نہیں رہی۔

حزب اختلاف کی غیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے آئندہ انتخابات میں اس کی کامیابی کے امکانات روشن نہیں۔ وہ اتنی سیٹیں بھی نہیں لے سکے گی جتنی اب ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت اس موقع سے فائدہ اٹھائے گی اور آئین کے نفاذ کے فوراً بعد انتخابات کرانے کا اعلان کر دے گی۔ ان انتخابات میں پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگی۔ انتخابات جتنی بھی جلدی ہوں، اتنا ہی پیپلز پارٹی کو فائدہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد وزراء کی بدعنوانیوں اور بعض ناقص پالیسیوں کی وجہ سے پیپلز پارٹی کی مقبولیت کم ہو رہی ہے۔ اسکا اعتراف خود صدر بھٹو بھی کر چکے ہیں۔

نئے آئین کی تیاری میں پاکستان پیپلز پارٹی نے جو کردار ادا کیا ہے، اس سے اس کی مقبولیت میں تھوڑا سا اضافہ ہوا ہے۔ ریاستی مشینری پر گرفت بھی مضبوط ہوتی ہے۔ اگر صدر بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے مخلص کارکنوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا تو وہ اپنی پارٹی کی مقبولیت میں اور زیادہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ پیپلز پارٹی کی ساکھ کو بحال کرنے کا آخری موقع ہے۔ اس کے بعد تاریخ انہیں دوسرا موقع نہیں دے گی۔ اس لئے یہ پاکستان پیپلز پارٹی کے مفاد میں ہے کہ وہ اپنی گزشتہ پندرہ ماہ کی پالیسیوں اور حکمت عملی کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرے۔ اس پارٹی کی مقبولیت میں کمی کی وجہ یہ ہے کہ پارٹی کے انتخابی منشور اور بنیادی اصولوں پر عمل نہیں کیا گیا۔ بعض وزراء نے بدعنوانیاں کیں، رشوت کا بازار گرم کیا اور دونوں ہاتھوں سے دولت اکٹھی کی۔ بعض نے سرمایہ داروں وڈیروں اور نوکر شاہی سے مل کر مزدوروں اور کسانوں پر فائرنگ کروائی اور ان کا معاشی قتل عام کیا۔ ان باتوں کا صدر بھٹو کو بھی علم ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ان بدعنوان اور عوام دشمن عناصر کو پارٹی سے نکال دیا جائے۔ اور ایسے وزراء کا انتخاب کیا جائے، جنہوں نے ابتداء ہی سے پارٹی کا ساتھ دیا تھا۔ اور بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں پارٹی کے عام کارکنوں سے مشورہ لیا جائے۔

اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کے دست و بازو اور اسے برسر اقتدار لانے والے ہزاروں مزدور، کسان اور طالبعلم پابند سلاسل ہیں۔ ایک بھاری تعداد ڈی پی آر کے تحت قید و بند میں مبتلا ہے۔ سینکڑوں کے وارنٹ گرفتاری ہیں۔ ہزاروں مزدور بے روزگار ہیں۔ ہزاروں کسانوں کو اراضی سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ یہ افراد پیپلز پارٹی کے دشمن ہیں نہ صدر بھٹو کے، یہ محب وطن بھی ہیں۔ لیکن بدعنوان وزیروں نے سرمایہ داروں، وڈیروں اور نوکر شاہی سے گٹھ جوڑ کر کے انہیں "ملک دشمن" قرار دے دیا ہے۔ صدر بھٹو نے اپنی متعدد تقریروں اور تحریروں میں محنت کش عوام کو اپنا دوست، ساتھی قرار دیا ہے وہ عوام کو طاقت کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جب ایوب خان کے زمانے میں انہوں نے وزارت خارجہ سے استعفیٰ دیا تو ان کے سرمایہ دار اور وڈیرے دوست ملنے سے گھبراتے تھے۔ اور یہ صرف محنت کش، طلبہ اور عوام تھے جنہوں نے بھٹو صاحب کو اپنے سر اور آنکھوں میں جگہ دی اور اپنے کندھوں پر بٹھا کر صدارت کی کرسی تک پہنچایا۔ نئے آئین کی توثیق کے بعد صدر بھٹو نے حزب اختلاف سے اچھے تعلقات پیدا کرنے کے لئے رجعت پسند جماعت کے ترجمان "جسارت" سے پابندی ہٹالی، اس کے مدیر، ناشر اور پرنٹر کو رہا کر دیا۔ تو کیا وجہ ہے کہ صدر بھٹو ان ہزاروں مزدوروں اور کسانوں کو بھول گئے جو پابند سلاسل ہیں۔ جب پورے ملک میں جشن آئین منایا جا رہا تھا۔ شہروں میں چراغاں ہو رہا تھا۔ دعوتیں ہو رہی تھیں۔ اس وقت ملک کی مزدور بستیوں اور دیہاتوں میں ہزاروں گھر تاریک تھے۔ ہزاروں بوڑھے، عورتیں اور بچے فاقہ زدہ تھے۔ کیا اچھا ہوتا کہ حکومت ان مزدوروں اور کسانوں کی رہائی، وارنٹ گرفتاری کی واپسی اور ملازمتوں پر بحالی کا اعلان کر دیتی، تو اس سے جشن آئین کی شان دوبالا ہو جاتی۔ اب بھی اگر اعلان کر دیا جائے تو یقیناً حکومت اور محنت کشوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا ہو جائیں گے۔

اب تک پاکستان میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء، ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۲ء کے دساتیر کا نفاذ رہ چکے ہیں۔ اب تیسرا آئین بنایا گیا ہے۔ یہ چاروں کے اہم نکات درج ذیل ہیں۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء

- برطانوی ہندوستان ایک وفاق ہوگا۔
- برطانوی ہندوستان کے صوبوں کی وفاق میں شرکت لازمی ہوگی۔ دیسی ریاستوں کی وفاق میں شمولیت لازمی نہیں ہوگی۔ دیسی ریاستیں اگر وفاق میں شامل ہونا چاہیں تو وہ ایک معاہدہ شمولیت کے ذریعے وفاق میں شامل ہو سکتی ہیں۔ اس معاہدے میں ان اختیارات کی وضاحت کرنی ہوگی جو مرکز کے حوالے کئے جائیں گے۔ یہ اختیارات عموماً دفاع امور خارجہ، ذرائع آمد و رفت اور مالیات ہونگے۔
- مرکزی مجلس قانون ساز دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی اس کی میعاد ۵ سال ہوگی۔ ایوان زیریں میں ۳۲۵ ارکان ہوں گے۔ ۲۰۰ ارکان برطانوی ہندوستان کے صوبوں کے، اور دیسی ریاستوں کے ۱۲۵، ایوان بالا ۲۶۰ ارکان پر مشتمل ہوگا۔ صوبوں کے نمائندے ۱۵۶ اور ریاستوں کے ۱۰۴ ہوں گے۔ صوبوں کے نمائندوں منتخب اور ریاستوں کے نامزد ہوں گے۔ (مرکزی مجلس قانون ساز خود مختار اور آزاد ادارہ نہیں تھا۔ اس کے اختیارات محدود تھے۔ برطانوی پارلیمان کو اقتدار اعلیٰ حاصل تھا۔ ہندوستان کی مرکزی مجلس قانون ساز آرمی ایکٹ اور ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں ترمیم نہیں کر سکتی تھی۔ برطانیہ کے تجارتی مفادات کے منافی قوانین نہیں بنا سکتی تھی۔ کچھ بلوں کو پیش کرنے سے پہلے وائسرائے کی منظوری لازمی تھی اور ۸۰ فی صد بجٹ NONVOTE ABLE البتہ اس پر ایوان میں بحث ہو سکتی تھی)
- ایک فیڈرل کورٹ قائم کیا جائے گا جو دستور کی تشریح کرے گا۔ اس کو ابتدائی سماعت اور اپیل سننے کا حق ہوگا (لیکن فیڈرل کورٹ بھی خود مختار اور آزاد نہیں تھا۔ اس کے فیصلوں کیخلاف پریوی کونسل میں اپیل کی جا سکتی تھی۔)
- اختیارات کی تین فہرستیں، مرکزی، صوبائی اور مشترکہ فہرست ہوں گی۔ مشترکہ فہرست کے کسی اختیار اور موضوع کے بارے میں کہ وہ مرکز سے متعلق ہے یا صوبہ سے، اس کا فیصلہ وائسرائے کرے گا۔
- مرکز میں دوہری طرز حکومت کا نظام قائم کیا جائے گا۔ دفاع۔ امور خارجہ، مذہبی معاملات اور قبائلی امور براہ راست وائسرائے کے پاس ہوں گے۔ وائسرائے تین کونسل افسروں کی مدد سے ان فرائض کو انجام دے گا۔ باقی امور وزیروں کی مدد سے طے کئے جائیں گے۔ وائسرائے کو حق استرداد

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں

پارلیمانی دور کے چند واقعات

انہوں نے بھرے ایوان میں پیر صاحب کی شلوار کھول دی

وھاب صدیقی

یہ ۱۹۲۴ء کا ذکر ہے۔ میاں ممتاز دولتانہ کے والد محترم میاں احمد یار اور ان کے یارِ غار نواب عاشق حسین پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن تھے۔ کونسل کا بجٹ اجلاس ہو رہا تھا۔ ایک رکن پیر سید محمد حسین بجٹ میں تخفیف کی ترمیم پیش کرنا چاہتے تھے۔ میاں احمد یار دولتانہ اور نواب عاشق حسین اس ترمیم کے حق میں نہ تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ یہ ترمیم پیش نہ ہو۔ وہ پیر صاحب کے پاس گئے اور انہیں تخفیف کی ترمیم واپس لینے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی، پیر صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے اور اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ جب مذاکرات ناکام ہو گئے۔ پیر صاحب کو سمجھانے کی تمام کوششیں رائیگاں گئیں۔

تو میاں احمد یار دولتانہ نے پیر صاحب کو اپنی عزت کا واسطہ دیا۔ اور اپنی پگڑی اتار کر ان کے قدموں میں رکھ دی۔ اور کہا "چاچا! اس پگڑی کی لاج رکھ لو۔" پیر صاحب نے پگڑی میاں احمد یار کے سر پر رکھتے ہوئے کہا "بھتیجے! اس بات پر مجبور نہ کر، یہ ترمیم میں ضرور پیش کروں گا۔" اگلے دن پیر صاحب ڈھیلے ڈھالے کرتے اور شلوار میں ملبوس، اپنی بھاری بھرکم پگڑی سنبھالتے ہوئے ترمیم پیش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ ان کے برابر نواب عاشق حسین کی سیٹ تھی، وہ اپنی سیٹ پر بیٹھے ہوئے بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے اور پیر صاحب کو ترمیم پیش کرنے سے روکنے کے لئے آخری حربہ سوچ رہے تھے۔ اچانک ان کی نظر پیر صاحب کے لٹکتے ہوئے ازار بند پر پڑی۔ ان کے ذہن میں فوراً ایک تجویز آئی، انہوں نے ڈیسک کی آڑ میں چھپ کر اور ہاتھ نیچا کرکے پیر صاحب کا ازار بند کھینچ لیا۔ ادھر پیر صاحب کی زبان سے تقریر کا پہلا لفظ "جناب والا" نکلا، ادھر ان کی شلوار کھل گئی۔ شلوار کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے اور پکڑتے ہوئے وہ فوراً اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ اسپیکر نے چند لمحے انتظار کیا کہ پیر صاحب اپنی ترمیم پیش کریں۔ لیکن وہ اپنی شلوار کا ازار بند باندھنے میں مصروف تھے۔ چنانچہ اسپیکر نے اگلے رکن کا نام پکارا۔ اس طرح پیر صاحب اپنی ترمیم پیش نہ کر سکے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا مقصد میاں احمد یار دولتانہ اور نواب عاشق حسین پر دشنام طرازی کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ ہمارے ہاں ابتدا ہی سے جمہوری اور پارلیمانی روایات کو پامال کیا گیا۔ مخالفین کو دبانے کی کوشش کی گئی۔ اور انہیں اسمبلی میں بھی آواز بلند کرنے سے روکا گیا۔

قیوم خان نے سرحد اسمبلی کو توڑنے کا مشورہ دیا تھا

قیام پاکستان کے وقت سرحد میں کانگریس کی تھی۔ جس کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب تھے۔ انہوں نے پاکستانی پرچم کو سلامی دینے سے گریز کیا۔ تو قائد اعظم کے حکم پر گورنر سرحد سر جارج کنگھم نے ڈاکٹر خان صاحب کی کابینہ کو ۲۲ر اگست ۱۹۴۷ء کو برخاست کر دیا۔ اور قیوم خان کو کابینہ بنانے کی دعوت دی گئی۔ جو انہوں نے فوراً قبول کر لی۔ اس طرح خان قیوم کی حصول اقتدار کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔ لیکن اس وقت سرحد اسمبلی میں پارٹی پوزیشن یہ تھی کہ کانگریس کی ۲۲، اور مسلم لیگ کی پندرہ سیٹیں تھیں۔ اس پر طرہ یہ کہ بعض مسلم لیگی رکن مثلاً پیر صاحب آف مانکی شریف خان قیوم کے مخالف تھے۔ خان قیوم وزیر اعلیٰ تو بن گئے۔ لیکن وہ اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔ مارچ ۱۹۴۸ء میں بجٹ کا بل بھی منظور کروانا تھا۔ جو وہ اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پاس نہیں کروا سکتے تھے چنانچہ انہوں نے سرحد کے گورنر کو مشورہ دیا کہ صوبائی اسمبلی کو برخاست کرکے ہر تیسرے سال ریفرنڈم کے ذریعے کسی شخص کو لیڈر منتخب کیا جائے اور وہ لیڈر اپنے تین چار ساتھیوں کی مدد سے کاروبار حکومت چلائے لیکن گورنر نے اس جمہوریت کش مشورہ کو مسترد کر دیا۔ اور



قرآن کے ورق پر دولتانہ اور گیلانی کے درمیان ہونے والے سمجھوتے کا عکس

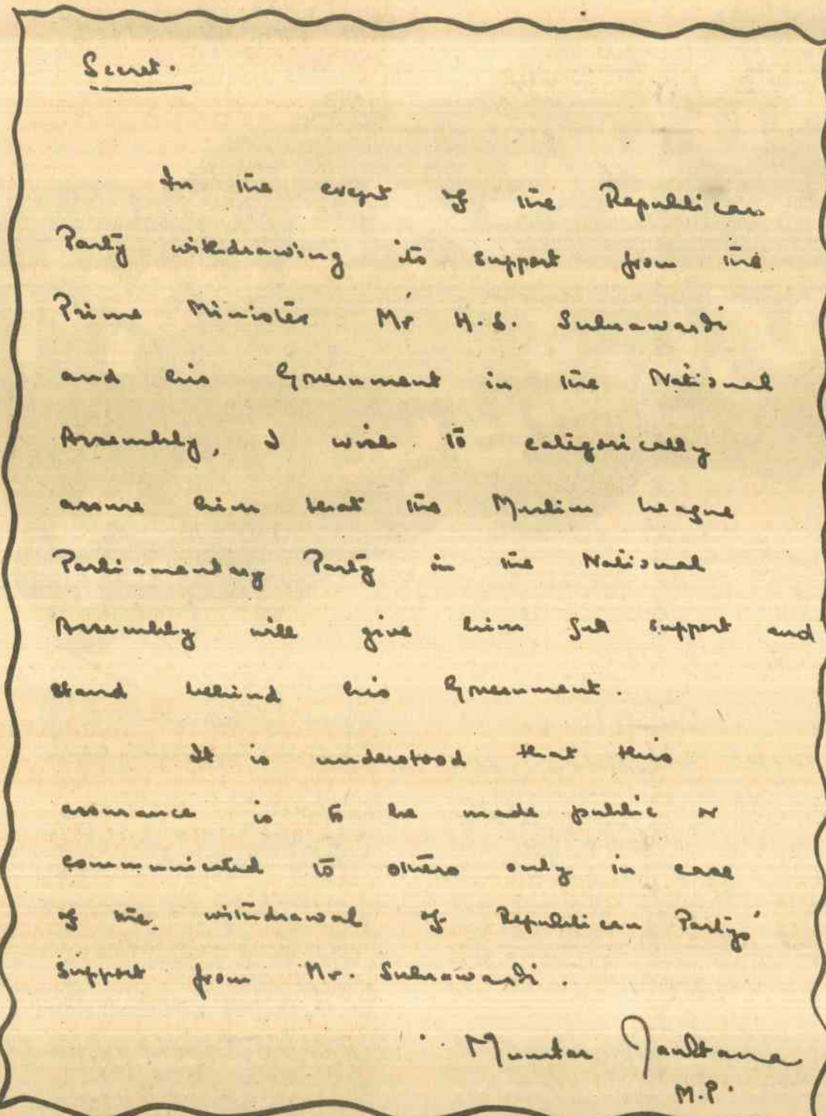
کہاکہ "اگر آپ بجٹ کابل اسمبلی سے پاس نہیں کروا سکے، تو آپ کی کابینہ کو برخاست کر دیا جائے گا۔" اس دھمکی کے بعد خان قیوم نے اسمبلی کے کانگریسی ارکان کو اپنا حامی بنانے کے لئے بھاگ دوڑ شروع کی، کانگریسیوں سے ان کی پرانی یاد اللہ تھی، کیونکہ ایک زمانہ میں وہ خود بھی کانگریس میں تھے۔ اور مرکزی قانون ساز اسمبلی میں کانگریس کے ڈپٹی لیڈر تھے۔ خان قیوم کی بھاگ دوڑ رنگ لائی اور جنوری ۴۸ء میں سرحد اسمبلی کے سات کانگریسی ارکان نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کرلی۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑے بغیر وہ مسلم لیگ کے نام پر حکومت کرنے کے حق دار بن گئے۔ اس گٹھ جوڑ کے ذریعے قیوم خان مارچ ۴۸ء میں بجٹ پاس کروانے میں کامیاب ہو گئے۔

جاگیردارانہ نظام کے مخالفین کو حکومت اور پارٹی سے نکال دیا گیا

پنجاب کی ممدوٹ کابینہ میں میاں افتخار الدین وزیر مہاجرین اور بحالیات تھے، انہوں نے مہاجرین کی آبادکاری کا جامع اور انقلابی منصوبہ بنایا۔ پنجاب مسلم لیگ کے انتخابی منشور کے مطابق انہوں نے یہ تجویز پیش کی، کہ تمام جاگیرداریاں اور بڑی بڑی زمینداریاں ختم کر کے مہاجرین کو آباد کیا جائے اور انہیں مالکانہ حقوق دیئے جائیں۔ زمین کی قیمت قسط وار وصول کی جائے۔ پنجاب کے وزیر خزانہ ممتاز دولتانہ اور وزیر مال سردار شوکت حیات نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ دولتانہ نے کہاکہ "حکومت پنجاب مہاجرین کی آبادکاری پر سات کروڑ روپیہ سالانہ خرچ کر رہی ہے۔ اس لئے جاگیرداریاں اور زمینداریاں ختم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نواب ممدوٹ نے بھی اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس تجویز کی پاداش میں میاں صاحب کو مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔

قرآن کے ورق پر تحریری معاہدہ

۱۹۴۸ء میں نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی کا آغاز ہوا۔ دولتانہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ بننا چاہتے تھے۔ کابینہ میں پھوٹ پڑنے سے حکومت کی کارکردگی متاثر ہوئی تو لیاقت علی کی ہدایت پر گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی نے ممدوٹ کابینہ برطرف کر دی اور گورنر راج قائم کر دیا۔ ممتاز دولتانہ نے ممدوٹ کابینہ کی برطرفی سے پہلے ہی گٹھ جوڑ شروع کر دیا تھا۔ حصولِ اقتدار کے لئے وہ قرآن کو بھی سیاست میں لے آئے اور لوگوں کے مذہبی جذبات سے


Secret.

In the event of the Republican Party withdrawing its support from the Prime Minister Mr H. S. Suhrawardi and his Government in the National Assembly, I wish to categorically assure him that the Muslim League Parliamentary Party in the National Assembly will give him full support and stand behind his Government.

It is understood that this assurance is to be made public or communicated to others only in case of the withdrawal of Republican Party's support from Mr. Suhrawardi.

Mumtaz Daultana
M.P.

مسلم لیگی ارکان اسمبلی کے نام ممتاز دولتانہ کا خفیہ خط

فائدہ اٹھایا۔ گیلانی خاندان، ملتان کا مذہبی اور نہایت با اثر خاندان ہے میاں دولتانہ نے ۱۹۴۹ء میں قرآن کے ایک ورق پر ان سے تحریری معاہدہ کیا۔ جس میں کہا گیا کہ گیلانی خاندان، دولتانہ کی الیکشن میں حمایت کرے گا۔ اور اس کے بدلے میں میاں دولتانہ گیلانی خاندان کی سیاسی برتری تسلیم کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی دولتانہ کے یار غار سید علی حسین گردیزی نے گیلانی خاندان سے تعاون کا معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ بھی قرآن کے ورق پر لکھا گیا تھا۔ ضلع ملتان میں دولتانہ محض گیلانی خاندان کی حمایت کی بدولت الیکشن میں کامیاب ہوئے۔ لیکن بعد میں وہ اس معاہدہ سے منحرف ہو گئے۔ دیکھیے ان سیاست دانوں نے ہوس اقتدار کے لئے قرآن اور اسلام کو کس طرح استعمال کیا۔

ون یونٹ بنانے کے لئے سرحد اور سندھ کی کابینہ برطرف کر دی گئی

نوکر شاہی کے کل پرزوں نے تومینوں کا استحصال کرنے اور مرکز کو مضبوط بنانے کے لئے ون یونٹ کا منصوبہ بنایا۔ مرکزی حکومت کے اس منصوبے کی مخالفت سب سے پہلے سرحد میں سردار رشید کی کابینہ اور سندھ میں پیرزادہ عبدالستار کی وزارت نے کی، ون یونٹ کے منصوبے کے لئے صوبائی اسمبلیوں کی منظوری ضروری تھی۔ لہٰذا گورنر جنرل غلام محمد نے مشتاق احمد گورمانی کے مشورہ سے دونوں صوبوں کی کابینہ برطرف کر دی۔ سرحد میں سردار بہادر خان اور سندھ میں ایوب کھوڑو کو وزیر اعلیٰ بنایا گیا۔ ان دونوں افراد نے گٹھ جوڑ کر کے ون یونٹ کے قیام کی قرارداد صوبائی اسمبلیوں سے منظور کروالی

اسمبلی کیفے ٹیریا میں گٹھ جوڑ

چوہدری محمد علی کے بعد حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بنے۔ ان کی کابینہ مخلوط کابینہ تھی۔ اس میں عوامی لیگ اور ری پبلیکن پارٹی کے ارکان شامل تھے۔ ری پبلیکن پارٹی کے

باقی صفحہ ۳۲ پر ملاحظہ فرمائیں

غلام محمد سے ایوب خان تک

سی آئی اے کے سربراہ سے ایوب خان کا قریبی رابطہ تھا



مندرجہ ذیل مضمون ہندوستانی ادیب اور صحافی جمنا داس اختر کی مشہور کتاب "پولیٹیکل کونسپیریسز اِن پاکستان" کا ایک باب ہے۔ اس وقت جب کہ ہم ایک سیاسی بحران سے دوچار ہیں، ماضی کے سیاسی "ورثے" کا مطالعہ ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی روشنی میں یہ مضمون قارئین کی نذر ہے۔

(ادارہ)



جمنا داس اختر

برطانیہ نواز خواجہ ناظم الدین، وزیرِ اعظم لیاقت علی کے جانشین تھے۔ لیکن وہ بھی اپنے پیشرو کی طرح اقتدار کے بھوکے سیاست دانوں کے مختلف دھڑوں کو مطمئن نہیں کر سکے۔ لیاقت علی کے قتل میں ممتاز سیاست دانوں کے ملوث ہونے کی افواہیں نہ صرف پاکستان میں بلکہ غیر ملکی دارالحکومتوں میں بھی عام تھیں۔ عوام میں برطانیہ کے خلاف جو جذبات پائے جاتے تھے، وہ مغربی پاکستان کے مختلف حصوں میں ایک منظم ایجی ٹیشن کی صورت میں پھٹ پڑے۔ کئی سیاسی جماعتوں نے جنہیں مبینہ طور پر مغربی پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ میاں ممتاز دولتانہ کی حمایت حاصل تھی، احمدیوں کو مذہبی اقلیت قرار دینے اور وزیرِ خارجہ ظفر اللہ خان اور برطانیہ نواز احمدی فرقہ سے متعلق دوسرے سول و فوجی افسروں کی برطرفی کا مطالبہ کر دیا۔ لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی، ملتان اور کراچی میں احمدیوں کے خلاف فسادات پھوٹ نکلے۔ جنونی ٹولوں نے احمدیوں سے متعلق املاک کی لوٹ مار کی اور انہیں نذرِ آتش کر دیا۔ کئی احمدی قتل کر دیئے گئے۔

دریں اثنا بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ نے جو ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی تھی، پنجاب اور سندھ میں بے چینی پیدا کر دی۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان مساوات اس رپورٹ کی بنیادی خصوصیت تھی۔ پنجاب اور سندھ کے سیاست دانوں کو اندیشہ تھا کہ مشرقی پاکستان کو بالادستی حاصل ہو جائے گی کیونکہ بنگالی سیاست دانوں نے سندھ اور کراچی کے سیاست دانوں سے مل کر ایک محاذ بنا لیا ہے۔

پنجاب کے قائدین نے احمدیوں کے خلاف فسادات کی حمایت کی جو بہت جلد بغاوت کی شکل اختیار کر گئی۔ خواجہ ناظم الدین کی حکومت نے لاہور اور مغربی پاکستان کے کچھ دوسرے شہروں میں مارشل لاء لگا دیا۔ دولتانہ کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا۔ فوج نے متعدد مقامات پر فائرنگ کی، جن میں لاہور، سیالکوٹ اور راولپنڈی بھی شامل ہیں۔ امریکی اخبارات میں شائع ہونے والی اطلاعات کے مطابق اس فائرنگ کے نتیجہ میں تقریباً دو ہزار افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ تقریباً تمام مذہبی رہنماؤں کو گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا۔ فوج نے لاہور میں کشمیری گیٹ کی مسجد پر قبضہ کر لیا اور کئی باغیوں کو ہلاک کر دیا، جنہوں نے اس مسجد کو اپنی نام نہاد آزاد حکومت کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا تھا۔ جس کے سربراہ مولانا عبدالقادر نیازی تھے۔ (اس تحریک کے ایک رہنما شیخ حسام الدین نئی دہلی گئے تھے اور انہوں وزیرِ اعظم نہرو سے ملاقات کر کے اپنی مجوزہ بغاوت کے لئے مدد طلب کی تھی لیکن نہرو نے ان کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ حسام الدین اس روز میرے ساتھ تھے، جب حکومتِ پاکستان نے کراچی میں تحریک کے آٹھ ممتاز رہنماؤں کو گرفتار کیا تھا۔ شیخ صاحب کو جیسے ہی یہ خبر ملی وہ پاکستان روانہ ہو گئے اور سرحد پار کرتے ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو بازی الٹ گئی، اور خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل غلام محمد کے ہاتھوں خود کو برطرف پایا۔ پاکستان چونکہ اس وقت بھی برطانیہ کی ایک سلطنت تھا، اس لئے خواجہ ناظم الدین نے ملکہ برطانیہ سے رابطہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کی لیکن انہوں نے اپنا ٹیلیفون کٹا ہوا پایا۔ گورنر جنہوں نے

برطرفی کے ساتھ ہی خواجہ صاحب کا ٹیلیفون کاٹ دیا گیا

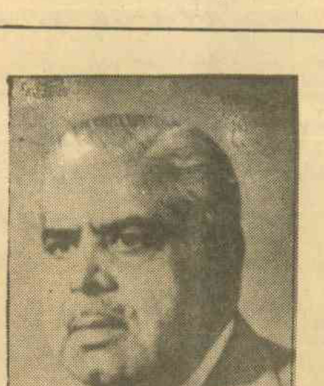
خواجہ ناظم الدین کی برطرفی سے تین دن قبل "مشرقِ وسطیٰ کے امریکی دوستوں کے ایک پُراسرار وفد سے ملاقات کی تھی، محمد علی بوگرہ کو نیا وزیرِ اعظم مقرر کر دیا جو اس وقت امریکہ میں سفیر تھے۔ بوگرہ صاحب کا کوئی سیاسی پس منظر نہیں تھا اور وہ ناظم الدین کی برطرفی سے صرف ایک دن پہلے واشنگٹن سے کراچی آئے تھے۔

۱۹۵۳ء کے موسمِ خزاں میں محمد علی بوگرہ نے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کے ہمراہ امریکہ کا دورہ کیا۔ دسمبر ۵۳ء میں امریکی نائب صدر رچرڈ نکسن کراچی آئے۔ امریکہ کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات مئی ۵۴ء میں پاکستان کے ساتھ باہمی دفاعی امداد کے سمجھوتہ پر منتج ہوئے۔ پاکستان نے ستمبر ۵۴ء میں سیٹو میں شمولیت اختیار کی اور فروری ۵۵ء میں بغداد پیکٹ عرف سنٹو میں شامل ہو گیا۔ ان سمجھوتوں کے نتیجہ میں پاکستان امریکہ کے زیرِ اثر آ گیا۔ بوگرہ کی حکومت نے گلگت اور سرحد میں امریکہ کو اپنے فوجی اور جاسوسی کے اڈے قائم کرنے کی اجازت دے دی۔

ان معاہدوں پر دستخط کرنے کی وجہ پاکستانی رہنماؤں کے وہ اندیشے تھے جو بھارت کے سلسلہ میں وہ محسوس کرتے تھے۔ جبکہ امریکہ، روس اور چین کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو روکنا اور بھارت پر سیاسی دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ تاہم یہ معاہدے بھارت اور روس کو ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ ۱۹۵۵ء میں روسی وزیرِ اعظم خروشچیف نے اعلان کر دیا کہ کشمیر بھارت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ اس کے بعد روس نے سلامتی کونسل میں کشمیر سے متعلق ہر ایک قرارداد کو ویٹو کر دیا۔ جو امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی طرف سے پیش کی گئیں اور جن کی بھارت نے مخالفت کی۔

مارچ ۵۴ء میں مشرقی پاکستان میں مسلم لیگ کی تباہ کن شکست نے وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کی پوزیشن کمزور کر دی، جو مسلم لیگ کے صدر بھی تھے۔ جناب اے۔ کے فضل الحق کی زیرِ قیادت متحدہ محاذ نے وزارت بنائی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہی صنعتی علاقے میں بنگالی اور غیر بنگالی مسلمانوں کے درمیان فسادات شروع ہو گئے۔ ان میں سے ایک فساد میں چار سو افراد تک ہلاک ہوئے۔ مشرقی پاکستان کے وزیرِ اعلیٰ کو کراچی طلب کر لیا گیا۔ انہوں نے ملکی خود مختاری کے لئے ایک بیان جاری کیا۔ ۲۹ مئی ۵۴ء کو ان کی وزارت توڑ دی گئی اور گورنر راج نافذ کر دیا گیا، اور سیکرٹری دفاع میجر جنرل اسکندر مرزا کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔

چونکہ بنگالی وزیرِ اعظم نے سندھ اور سرحد کے سیاسی لیڈروں کے ساتھ اپنا محاذ بنا لیا تھا۔ اس لئے گورنر جنرل نے ان کی پوزیشن محدود کرنے کا فیصلہ کیا اور مغربی پاکستان کے مختلف صوبوں کو ایک یونٹ میں ضم کرنے کا تہیہ کر لیا اور دھمکی دی کہ اگر سندھ کے رہنماؤں نے انکے منصوبے کی حمایت نہ کی تو وہ سرکاری اور نمائندہ افسروں کی نااہلیت کے قانون کے تحت ان کے خلاف کارروائی شروع کر دیں گے۔ شہر میں وزیرِ اعظم نے آئین ساز اسمبلی سے اس قانون کو منسوخ کرا دیا اور چند روز بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کرنے کے لئے ایک بل پیش کیا تاکہ یہ بات یقینی بنائی جائے کہ گورنر جنرل اس ایکٹ کو کسی ایسی وزارت کو توڑنے کے لئے استعمال نہ کر سکے، جسے ایوان کا اعتماد حاصل ہو۔ یہ سب کچھ اس روز آدھے گھنٹے میں ہو گیا، جس دن گورنر جنرل کراچی سے باہر تھے۔ وزیرِ اعظم گورنر جنرل سے محاذ آرائی سے بچنے کے لئے ملک چھوڑ کر امریکہ چلے گئے تاکہ قرضہ کے سمجھوتہ کے مذاکرات کر سکیں۔ گورنر جنرل اس رویہ سے سخت مشتعل



مشتاق احمد گورمانی

ہوئے اور انہوں نے وزیرِ اعظم کو کراچی پہنچنے کا حکم دیا جو لرزتے ہوئے کراچی لوٹ آئے۔ انہیں اپنی برطرفی اور گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ ایوب خان اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں رقمطراز ہیں کہ گورنر جنرل نے ان سے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لئے کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور مفاہمت کرا دی۔ تاہم گورنر جنرل نے آئین ساز اسمبلی کو توڑ دیا۔ اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین نے سندھ ہائیکورٹ کی مداخلت



خواجہ ناظم الدین

چاہی اور کورٹ نے گورنر کے احکامات کے منافی فیصلہ دیدیا۔ چنانچہ مرکزی حکومت نے اس فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ سے اپیل کی۔ مارچ ۵۵ء میں سپریم کورٹ نے فیصلہ دیتے ہوئے اعلان کیا کہ وہ ایکٹ، جس کے تحت اسمبلی کے صدر نے سندھ کورٹ سے اپیل کی ہے، غیر قانونی ہے کیونکہ اسے گورنر جنرل کی منظوری حاصل نہیں۔ کورٹ نے ایک اور فیصلہ دیا کہ گورنر جنرل کو آئین ساز اسمبلی توڑنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اسمبلی نے وہ فرض انجام نہیں دیا ہے، جو اسے تفویض کیا گیا تھا کہ وہ ملک کو ایک آئین دے گی۔

(پاکستان میں آئینی مسائل، کیمبرج یونیورسٹی پریس ۵۶ء، ص ۲۸۳)

اگرچہ گورنر جنرل نے اپنے وزیرِ اعظم کو فوری طور پر برطرف نہیں کیا لیکن وزیر اعظم کا وقار ختم ہو گیا۔ گورنر جنرل پہلے ہی اسکندر مرزا جیسے سول سرونٹس کو اپنی کابینہ میں لا چکے تھے۔ سول سروس کے ایک اور سابق سربراہ چودھری محمد علی وزارتِ خزانہ کے سربراہ تھے۔ کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کے پاس وزارتِ دفاع تھی۔ گورنر جنرل نے عبدالقیوم خان کو سرحد کی وزارتِ اعلیٰ سے مستعفی ہو کر کابینہ میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا اور ان کی جگہ سابق انسپکٹر جنرل پولیس سردار عبدالرشید کو سرحد کا وزیرِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ سندھ میں وزیرِ اعلیٰ پیرزادہ عبدالستار نے ایک بیان دیا، جس میں ون یونٹ اسکیم کی مخالفت کی گئی تھی۔ صوبائی اسمبلی کے ۱۱۰ ممبروں میں سے ۷۴ ممبروں کے اس بیان پر دستخط تھے۔ گورنر جنرل نے وزیرِ اعلیٰ کو برطرف کر دیا اور ان کی جگہ محمد ایوب کھوڑو کو مقرر کیا۔ ایوب کھوڑو نے ون یونٹ کی مخالفت کو سنگین نتائج کی دھمکی دی اور نتیجہ میں ۱۲ نومبر ۵۴ء کو انہیں ممبروں نے جنہوں نے ون یونٹ اسکیم کی مخالفت کی تھی، ۴ کے مقابلے ۱۰۰ ووٹوں سے منظوری دے دی۔ گورنر جنرل نے ون یونٹ کے تمام

اسکندر مرزا نے مولوی فضل الحق اور بھاشانی کے خلاف سہروردی کی حمایت کی تھی

مخالفین کو دھونس ودھمکی کے ہتھکنڈوں سے منتشر کرنے کے بعد، ۲۷ مارچ ۵۵ء کو ایک آرڈی ننس جاری کیا، جس کے ذریعے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں ترمیم کی گئی تھی اور مغربی پاکستان کا ون یونٹ بنانے کے تمام اختیارات خود سنبھال لئے تھے۔ انہوں نے مزید یہ بھی اعلان کیا کہ اب میں نے پورے ملک کو آئین دینے کے اختیارات بھی سنبھال لئے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ گورنر جنرل نے مغربی پاکستان کے تمام صوبوں میں اپنی فرمانبردار حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ مشرقی پاکستان میں بدستور گورنر راج قائم تھا۔ مشرقی پاکستان اسمبلی کا مئی ۵۴ء سے اجلاس نہیں بلانے دیا گیا تھا۔ گورنر اسکندر مرزا نے "گائیڈڈ ڈیموکریسی" کے خیال کی وکالت کرنا شروع کر دی تھی۔

گورنر جنرل نے جو ایک آرڈی ننس کے ذریعے اپنی پسند کا آئین نافذ کرنا چاہتے تھے، خود کو مشکلات میں گھرا ہوا پایا۔ ۲۷ مارچ ۵۵ء کو انہوں نے ایک آرڈی ننس جاری کیا اور اعلان کیا کہ انہوں نے کئی ایکٹوں کو بحال کر دیا ہے، جنہیں سپریم کورٹ کے فیصلوں نے ناجائز قرار دے دیا تھا۔ گورنر جنرل کے اس آرڈی ننس کو چیلنج کر دیا گیا۔ اور سپریم کورٹ نے سخت ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے انہیں تنبیہ کی۔

گورنر جنرل آئین ساز اسمبلی کے کسی قانون کی منظوری تو دے سکتا ہے یا منظوری دینے سے انکار تو کر سکتا ہے۔ لیکن وہ بذاتِ خود آئین ساز اسمبلی اور اس کے مفقود ہونے کی صورت میں نہ تو وہ ان اختیارات کا دعویٰ کر سکتا ہے جو اس کے پاس کبھی نہ تھے، اور نہ ہی وہ اسمبلی کے اختیارات کے لئے دعویدار ہو سکتا ہے۔ یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کراؤن کے ذمہ دار اٹارنی نے ہمارے روبرو جو رویہ اختیار کیا ہے، اس کے مطابق حکومت کا پہلا مسئلہ یہ ہو گا کہ ایک دوسرے نمائندہ ادارہ کو وجود میں لائے، جو آئین ساز اسمبلی کے اختیارات کو بروئے کار لائے تاکہ تمام ناجائز قوانین کو فوری سود: یے ادارہ کے ذریعے قانونی حیثیت دی جا سکے۔ اب



حسین شہید سہروردی

طریقہ کار ان آئینی روایات کے مطابق ہو گا جو ایسے حالات میں اپنائی جاتی ہیں۔ آرڈی ننس میں انتخابات کا کوئی ذکر نہیں اور تمام فاضل ایڈووکیٹ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انتخابات کرانے کا ارادہ ہے۔ سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ گورنر جنرل کے یک طرفہ طریقوں کے خلاف عملاً ایک وارننگ تھا۔ ایک دوسرے فیصلے میں گورنر جنرل کو بتایا گیا کہ وہ آئین ساز اسمبلی کے ممبروں کو نہیں بلکہ صرف رائے دہندگان کو نامزد کر سکتے ہیں۔

اس طرح گورنر جنرل کو آئین ساز اسمبلی کا اجلاس بلانے پر مجبور کر دیا گیا۔ درحقیقت وہ خود اپنی آمریت قائم کرنا چاہتے تھے لیکن کمانڈر انچیف نے ان کی حمایت نہیں کی۔

نئی آئین ساز اسمبلی صوبائی اسمبلی کے ممبروں نے منتخب کی۔ بلوچستان اور قبائلی علاقوں میں قبائلی سرداروں نے اپنے نمائندے منتخب کئے۔ اگست ۵۵ء میں گورنر جنرل نے وزیر اعظم کو مستعفی ہونے اور واپس امریکہ میں پاکستانی سفیر بننے کی ترغیب دی۔ اس طرح وہ بنگالیوں کے تسلط کے خطرہ کو دور کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

وزیر خزانہ چوہدری محمد علی کو ان کی جگہ نیا وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ ۳۰ ستمبر ۱۹۵۵ء کو آئین ساز اسمبلی نے ایک بل منظور کیا، جس میں گورنر جنرل کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مغربی پاکستان کو ختم کر کے ایک یونٹ بنا دے۔ اس وقت مشرقی پاکستان کے گورنر اسکندر مرزا نے علیل گورنر جنرل کو علالت کی تعطیلات پر جانے پر مجبور کر دیا، اور قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت میں قیوم خان کو اپنی کابینہ سے علیحدہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ کیونکہ ان پر شبہہ تھا کہ وہ اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے سازشوں میں ملوث ہو رہے ہیں۔ ۲ مارچ ۵۶ء کو نیا آئین نافذ کر دیا گیا۔ اسکندر مرزا نے خود کو پاکستان کا پہلا صدر منتخب کرا لیا۔ نئے آئین کے مطابق صدر صرف برائے نام سربراہ مملکت نہیں تھا بلکہ وزیر اعظم کا یہ فرض تھا کہ وہ انہیں پورے ایڈمنسٹریشن اور تجاویز قانون سے باخبر رکھے۔ آرٹیکل ۳۷(۳)



اسکندر مرزا

میں صدر کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی پسند کے وزیر اعظم مقرر کرے۔ اسکندر مرزا نے اس آرٹیکل کو استعمال کرتے ہوئے بار بار اپنی پسند کے افراد کو اس اعلیٰ عہدہ پر مقرر اور برطرف کیا۔ وہ سیاست دانوں میں پھوٹ ڈالنے کے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ اور "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی سے جو انہوں نے اپنے برطانوی آقاؤں سے سیکھی تھی، پوری طرح مستفید ہو رہے تھے۔

اسکندر مرزا خان عبد الغفار خان کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے۔ اور انہیں مغربی پاکستان کا وزیر اعلیٰ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جب مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی نے ڈاکٹر خان صاحب کی حمایت کرنے سے انکار کر دیا۔ صدر اسکندر مرزا نے کچھ ایسا انتظام کیا کہ صوبائی اسمبلی کے متعدد ممبر اپنی پارٹی سے علیحدہ ہو گئے اور ڈاکٹر خان صاحب سے آملے۔ جنہوں نے ری پبلکن پارٹی کے نام سے نئی سیاسی پارٹی بنائی۔ بعد میں پارٹی کے سیکرٹری جنرل نے انکشاف کیا کہ اس پارٹی کا منشور اور آئین گورنر مغربی پاکستان مشتاق احمد گورمانی نے بنایا تھا۔ وہ وہی ہیں جنہوں نے لیاقت باغ راولپنڈی کے اس جلسہ عام سے خود کو پُراسرار طور پر غیر حاضر رکھا تھا، جس میں ۱۶ اکتوبر ۵۱ء کو لیاقت علی خاں کو قتل کر دیا گیا۔

اسکندر مرزا ۴۷-۱۹۴۶ء میں پشاور   ہونے کے ساتھ ساتھ اس سیاسی محکمہ کے انچارج بھی رہ چکے تھے۔ جو رشوتوں اور سازشوں کے ذریعے قبائلی علاقوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ وہ ان قبائلی رہنماؤں کو ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریس وزارت کے خلاف تحریک چلانے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ خان عبد الغفار خاں انہیں غدار اور بدنام برطانوی ایجنٹ کے نام سے پکارتے تھے۔ لیکن اس پس منظر کے باوجود یہ اسکندر مرزا کی صورتِ حال سے نمٹنے کی مہارت تھی کہ وہ ڈاکٹر خان صاحب کو اپنے اشاروں پر ناچنے پر آمادہ کرنے میں

ری پبلکن پارٹی کا منشور مشتاق احمد گورمانی نے بنایا تھا

کامیاب ہو گئے۔ شاید ڈاکٹر صاحب کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ مسلم لیگ کو کچلنے کا یہ بہترین موقع ہے۔

اسکندر مرزا اتنے چالاک تھے کہ انہوں نے سہروردی تک کی حمایت حاصل کر لی جو مشرقی پاکستان میں پہلے ہی فضل حق اور مولانا بھاشانی کے ساتھ اس واضح شرط کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے کہ وہ مشرقی پاکستان کی داخلی خود مختاری کی حمایت کریں گے۔

سہروردی کی عوامی لیگ یہ وعدہ کر چکی تھی کہ وہ امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدوں سے پاکستان کی علیحدگی کے مطالبہ کی حمایت کرے گی۔ تاہم ان وعدوں کے باوجود وہ اسکندر مرزا سے مل کر ستمبر ۵۶ء میں وزیر اعظم بن گئے۔ شکاگو ٹائمز کے مطابق سہروردی کے وزیر اعظم بننے سے ایک سال پہلے یہ وہی اسکندر مرزا تھے جنہوں نے اعلان کیا تھا کہ سہروردی میری لائن پر ہی حکومت بنا سکے گا۔ اور یہ وہی سہروردی تھے جنہوں نے شکاگو ٹائمز کے نمائندے کو یقین دلایا تھا کہ وہ امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدوں کی حمایت کریں گے۔ نئی دہلی سویرا کی ۲۰ ستمبر ۵۶ء کی اشاعت کے مطابق سہروردی نے اپنے دورۂ لندن میں وزیر اعظم ایڈن کو یقین دلایا تھا کہ وہ پاکستان کا وزیر اعظم بننے کی صورت میں مغرب کے ساتھ پاکستان کے فوجی معاہدوں کو مستحکم کریں گے۔ بھاشانی اور ان کے حامیوں نے سہروردی کی مذمت کی۔ پنجاب میں مسلم لیگ نے جو اب بھی ایک طاقتور پارٹی تھی۔ سہروردی اور اسکندر مرزا پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ سندھ اور سرحد کے پرانے سیاست دانوں نے بھی ان کی مذمت کی۔

اسکندر مرزا نے مشرقی پاکستان میں وزارت برطرف کر دی اور اپنے پرانے دشمن فضل الحق سے گٹھ جوڑ کر لیا اور ان کے گروپ کرشک پرجا سمیتی کی وزارت قائم کر دی۔ صرف ایک سال پہلے اسکندر مرزا نے فضل الحق کو غدار قرار دیا تھا فضل الحق کا گروپ مرکزی اسمبلی میں اسکندر مرزا کا حامی ہو گیا بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایوب خان اپنے کٹر دشمن سہروردی کے ماتحت کام کرنے پر رضا مند ہو گئے، اور سہروردی امریکہ کے ساتھ پاکستان کے معاہدوں کی وکالت کرنے لگے۔

دریں اثنا میاں افتخار الدین کی نیشنل عوامی پارٹی نے اسکندر مرزا کے خلاف مہم شروع کر دی اور مغربی پاکستان میں ون یونٹ توڑنے کا مطالبہ بھی کر دیا۔ سرحد میں خان عبد الغفار خان نے پختونستان کے قیام کے لئے تحریک چلانے کی دھمکی دے دی۔ اسکندر مرزا نے ڈاکٹر خان صاحب کو ہدایت کی کہ وہ اپنے بھائی کی گرفتاری کا حکم دیں۔ اس نے پٹھانوں میں بے چینی پیدا کر دی۔

مسلم لیگ نے خان صاحب کی وزارت کا تختہ اُلٹنے کی کوشش میں نیشنل عوامی پارٹی سے اتحاد کر لیا۔ ری پبلکن پارٹی کے بہت سے ممبروں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر لیں۔ اور مسلم لیگ سے آملے۔ ایوب خان کے چھوٹے بھائی سردار بہادر خان مغربی پاکستان اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے لیڈر تھے۔ اسکندر مرزا نے سخت ردِ عمل ظاہر کیا۔ مغربی پاکستان میں دفعہ ۱۹۳ نافذ کر دی اور وزارت کو برطرف کر دیا۔ انہوں نے اپنے پٹھو مشتاق احمد گورمانی کو ہدایت کی کہ وہ گورنر راج قائم کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو ماہ کے بعد جب



گورنر راج ختم ہوا تو وہ ہی ری پبلکن پارٹی جسے ایوان میں شکست دے دی گئی تھی، دوبارہ برسر اقتدار آگئی۔ البتہ ڈاکٹر خان صاحب قیادت سے مستعفی ہو گئے اور سابق انسپکٹر جنرل پولیس سرحد سردار عبد الرشید کی جگہ پارٹی کے قائد مقرر کئے گئے۔ اب ری پبلکن پارٹی نیشنل عوامی پارٹی سے آملی اور ون یونٹ توڑنے کے عزائم کا اعلان کیا جس کے نتیجہ میں مرکز میں عوامی لیگ اور ری پبلکن پارٹی کے درمیان اتحاد ختم ہو گیا۔ نیشنل عوامی پارٹی نے زرعی اصلاحات کی بنیاد پر مسلم لیگ کی حمایت شروع کر دی۔ سردار عبد الرشید کو وزارت اعلیٰ سے مستعفی ہونے پر مجبور کر دیا گیا اور ری پبلکن پارٹی کی قیادت اور ان کی جگہ نواب مظفر علی قزلباش نے سنبھال لیا۔

مشرقی پاکستان میں نئے گورنر فضل الحق نے عطاء الرحمٰن خان کی وزارت برطرف کر دی۔ اسی دن اسکندر مرزا نے فضل الحق کو برطرف کر دیا۔ اور نئے وزیر اعلیٰ ابو حسین سرکار اپنا عہدہ سنبھالنے کے بارہ گھنٹے کے اندر اندر برطرف کر دیئے گئے۔ نئے گورنر نے عطاء الرحمٰن کو مشرقی پاکستان کا وزیر اعلیٰ مقرر کیا لیکن جلد ہی نیشنل عوامی پارٹی، جس کی قیادت مولانا بھاشانی کر رہے تھے، حمایت سے دستبردار ہو گئی۔ جس کے نتیجہ میں عطاء الرحمٰن کو ایوان میں شکست کھانے کے بعد مستعفی ہونا پڑا۔ ۱۹ جون ۱۹۵۸ء کو متحدہ محاذ کی وزارت قائم کی گئی لیکن اس دن وہ وزارت ٹوٹ گئی کیونکہ نیشنل عوامی پارٹی محاذ کی حمایت سے دستبردار ہو گئی تھی۔ اس صورتِ حال کے نتیجہ میں وزارت کا سنگین بحران پیدا ہو گیا، اور ۲۴ جون کو مشرقی پاکستان میں صدر راج نافذ کر دیا گیا۔ دو ماہ کے بعد گورنر نے عطاء الرحمٰن کی وزارت بحال کر دی لیکن مختلف دھڑوں کے درمیان کھلی رسہ کشی نے اسمبلی میں ۲۱ ستمبر کو بہت خراب صورتِ حال پیدا کر دی۔ ایوان نے اسمبلی کے اسپیکر کو پاگل قرار دے دیا اور ڈپٹی اسپیکر شاہد علی کو زدوکوب کر کے ہلاک کر دیا گیا۔

لاہور میں ڈاکٹر خان صاحب کو مئی ۵۸ء میں ایک خاکسار نے قتل کر دیا۔ ڈاکٹر خان صاحب نے اپنے قتل سے چند دن پہلے ایک بیان دیا تھا جس میں دھمکی دی تھی کہ اگر صورتِ حال بہتر نہیں ہوئی تو تمام سیاسی پارٹیوں پر پابندی لگا کر ملک میں ایک انقلابی کونسل قائم کر دی جائے گی۔ سہروردی کے حامیوں نے جوابی دھمکی دی کہ انقلابی کونسل کے جواب میں جمہوریت کے حامی متشدد طریقوں سے انقلاب برپا کر دیں گے۔ متعدد خاکسار جن میں ان کا سرکردہ لیڈر علامہ عنایت اللہ مشرقی بھی شامل تھے، گرفتار کر کے نظربند کر دیئے گئے۔ ڈاکٹر خان صاحب کے قریبی رشتہ داروں کو اب تک شبہ ہے کہ اس قتل کے پسِ پشت اسکندر مرزا تھے۔ مجھے اس مبینہ سازش کے بارے میں کوئی علم نہیں۔

تاہم مرزا صاحب کے ایک قریبی دوست سر فیروز خان نون نے انکشاف کیا ہے کہ اسکندر مرزا کو ڈاکٹر خان صاحب سے نفرت ہو گئی تھی۔ اسکندر مرزا ڈاکٹر خان صاحب سے کہا کرتے تھے کہ آپ میرے لئے ایک باپ کی طرح ہیں۔ اور انہوں نے ری پبلکن پارٹی بنانے کے لئے ڈاکٹر خان صاحب کے اثر و رسوخ کا پورا پورا استعمال کیا لیکن ایک موقعہ پر میں نے ایک ایسی بات کہتے سنی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسکندر مرزا ڈاکٹر خان صاحب کا اپنے گھر میں آنا تک پسند نہیں کرتے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب اسکندر مرزا کی خواہش تھی کہ ری پبلکن اور مسلم لیگی ممبر نئی پارٹی بنانے کے لئے متحد ہو جائیں کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہے تھے کہ انتخابات کے بعد تمہاری ری پبلکن پارٹی پارلیمنٹ میں واضح اکثریت حاصل نہیں کر سکے گی۔ لیکن ڈاکٹر خان

خان آف قلات کی بغاوت میں اسکندر مرزا کا ہاتھ تھا

صاحب ری پبلیکن پارٹی توڑنے پر رضامند نہیں ہونگے، جس کے وہ سربراہ ہیں۔ قاتل خاکسار عطاء اللہ جس نے اعترافِ جرم کر لیا تھا، اسے پھانسی دے دی گئی۔ اس عرصے کے دوران مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر ٹریڈ یونین کے کارکنوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی گئیں۔

دریں اثناء خان عبدالقیوم خاں مسلم لیگ کے صدر بن گئے۔ انہوں نے حکمران ٹولہ کے خلاف جہاد شروع کر دیا، اور نئے آئین کے تحت فوری طور پر عام انتخابات کرانے کا مطالبہ کیا، وہ کھل کر یہاں تک کہنے لگے کہ اگر حکومت نے انتخابات ملتوی کئے تو خون کے دریا بہہ جائیں گے۔

اسکندر مرزا آئین کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔ انہوں نے ملک کے ہر ایک سیاست دان کو پورا پورا بے نقاب اور بدنام کیا۔ وہ سنجیدگی سے کبھی بھی عام انتخابات کرانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ آئین منسوخ کرنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ درحقیقت وہ اس کے لئے اسٹیج تیار کر رہے تھے۔

(ایوب خان فرینڈز ناٹ ماسٹرز صفحہ ۵۴-۵۶)

اکتوبر ۵۶ء میں اسکندر مرزا نے ری پبلیکن پارٹی کے کئی ممبروں کو مرکزی کابینہ کی حمایت سے دستبردار ہونے کی ترغیب دی۔ سہروردی دن بدن طاقتور ہوتے جا رہے تھے، انہوں نے مسلم لیگ کے پنجابی رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا۔ وہ عام انتخابات کرانا چاہتے تھے اور اپنی پسند کا صدر لانا چاہتے تھے۔ اسکندر مرزا نے ان کی کابینہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا، سہروردی نے صدر کو قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کا مشورہ دیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا انہیں اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل ہے یا نہیں۔ اسکندر مرزا نے ان کا یہ مشورہ مسترد کر دیا اور سہروردی کو ہدایت کی کہ وہ فوری طور پر مستعفی ہو جائیں یا برطرفی کا سامنا کریں۔ سہروردی نے ۱۱ر اکتوبر ۵۷ء کو استعفیٰ دے دیا۔ ان کی جگہ آئی آئی چندریگر کو وزیر اعظم بنایا گیا، انہیں بھی ایسے ہی حالات میں مستعفی ہونا پڑا۔ اور دسمبر ۵۷ء میں پنجاب کے ملک فیروز خان نون وزیر اعظم بن گئے۔ انکے برطانیہ کے ساتھ پرانے تعلقات سے سب واقف تھے۔ انہوں نے ایوب کھوڑو کو وزیر دفاع مقرر کر دیا۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ اگرچہ ایوب خان مسلح افواج کے کمانڈر انچیف تھے لیکن وہ کابینہ کے جونیئر ممبر بننے پر آمادہ ہو گئے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکندر مرزا نے ان کے عہدہ کی میعاد میں دو سال کی توسیع کر دی تھی۔ علاوہ ازیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایوب خان صدر کا تختہ الٹنے کے لئے کسی مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ ایوب خان نے اپنی سوانح حیات میں اسکندر مرزا کے کردار پر سخت نکتہ چینی کی ہے لیکن وہ یہ بھول گئے ہیں کہ اسکندر مرزا نے جو بھی فیصلے کئے ان میں وہ خود بھی ایک فریق رہے ہیں۔

ملک میں صورتِ حال تیزی سے خراب ہو رہی تھی۔ مسلم لیگ خان قیوم کی قیادت میں حکمران ٹولہ کے لئے ایک خطرہ بن گئی تھی اور امریکہ کے ساتھ فوجی معاہدوں میں پاکستان کا مستقبل تاریک ہو چکا تھا۔ مسلم لیگ نے ان معاہدوں کی سخت مخالفت کا اعلان کر دیا تھا اور یہ واضح ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ کے برسرِ اقتدار آنے کی صورت میں پاکستان اپنے فوجی معاہدے منسوخ کر دے گا۔ مسلم لیگ ہزاروں مسلم رضاکاروں کو نیشنل گارڈز میں بھرتی کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ انہوں نے خون خرابہ کی دھمکی دی اور اس کے ساتھ ہی فوری انتخابات کرانے اور کشمیر پر چڑھائی کرنے کا مطالبہ کیا۔ خان آف قلات نے صورتِ حال اور زیادہ پیچیدہ بنا دی جیسے ہی انہیں مرکزی کابینہ سے علیحدہ کیا گیا، انہوں نے ایک طویل بیان جاری کیا جس میں انہوں نے قلات کو مغربی پاکستان کے ون یونٹ میں ضم کرنے پر نکتہ چینی کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اقدام اس سمجھوتہ کی خلاف ورزی ہے جس میں انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ ان کی ریاست کا مغربی پاکستان میں ایک علیحدہ یونٹ رہے گا۔ اپریل ۱۹۵۷ء میں قلات کے قبائلی علاقوں میں مسلح بغاوت ہو گئی اور بہت سے سپاہیوں کو سنگ باری کر کے ہلاک کر دیا گیا۔ نیم سرکاری اطلاعات کے مطابق بغاوت نے اکتوبر ۱۹۵۸ء میں سنگین رخ اختیار کر لیا۔ اخبارات میں پاکستانی پرچم اتار پھینکنے اور خان آف قلات کے آبائی پرچم کو قلات کے قلعہ پر لہرانے کی اطلاعات شائع ہوئیں۔ سرکاری بیان کے مطابق بائیں بازو کی استامن گل پارٹی کے لیڈر پرنس عبدالکریم ۱۹۴۸ء کے افغان لشکر اور خان کے چچا سلطان ابراہیم خاں مبینہ طور پر بغاوت میں افغانستان کی مدد طلب کر رہے تھے۔ باغیانہ پمفلٹ تقسیم ہوئے جس کا خرچ مبینہ طور پر خان آف قلات نے ادا کیا تھا۔ ان پمفلٹوں میں حکومت پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے قلات کا پاکستان کے ساتھ جبری الحاق کیا ہے اور جناح و لیاقت علی خان دونوں کو ملحد قرار دیا گیا تھا (کنسولیڈیشن آف نیشن صفحہ ۲۰۶) مزید کہا جاتا ہے کہ خان آف قلات نے پاکستان کے ساتھ اپنی وفاداری ترک کر دی۔ صدر سے ملنے سے انکار کر دیا اور اپنی گرفتاری کے خلاف تین سو مسلح قبائلیوں کے ساتھ مزاحمت کی۔ ۶ر اکتوبر کو وہ گرفتار کر لیئے گئے اور ان کے سب سے بڑے بیٹے داؤد یار کو جو برطانیہ میں زیرِ تعلیم تھا ان کی جگہ نیا خان مقرر کر دیا گیا۔

ایوب خان اپنی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" میں رقمطراز ہیں کہ اس وقت سنجیدگی کے ساتھ یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ بغاوت میں خان آف قلات کی اسکندر مرزا نے حوصلہ افزائی کی تھی جو اپنی قطعی کارروائی کے لئے راہ ہموار کر رہے تھے۔ وین اگز ولکوکس نے اپنی کتاب میں نشاندہی کی ہے کہ۔

مرکزی حکومت اور خان آف قلات کے کیس ایک دوسرے سے اتنے مختلف ہیں اور والی قلات کا استغاثہ اتنا غیر مبہم ہے کہ ہر شخص کو ان افواہوں پر اعتبار کرنا پڑتا ہے کہ جو کچھ نظر آتا تھا بغاوت اس سے کہیں کم تھی۔ ایک داستان یہ ہے کہ اسکندر مرزا نے ۸ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو انقلاب کی تیاری کر لی تھی۔ انہیں قوم میں پھوٹ پڑنے کی ایسی ڈرامائی مثال کی ضرورت تھی جو ان کے اختیارات سنبھالنے کی کارروائی کا جواز پیدا کر سکے۔

۱۹۵۸ء کے وسط میں ٹائمز آف کراچی نے ایک لیٹر شائع کیا تھا جو مبینہ طور پر مشتاق احمد گورمانی نے نائب بھارتی وزیر اعظم سردار پٹیل کو روانہ کیا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ میری کوششوں کے نتیجہ میں نواب آف بہاولپور اپنی ریاست کا بھارت کے ساتھ الحاق کرنے پر اس شرط کے ساتھ رضامند ہو گئے ہیں کہ بھارت بیکانیر، جیسلمیر اور بہاولپور ان کی حکمرانی میں دے دیا گیا۔ ریاست کے مسلمانوں کے جذبات اپنی انتہا پر تو ہیں لیکن ان کی یہ برہمی عارضی ہے اور بالآخر ان کے جذبات سرد پڑ جائیں گے کیونکہ ریاست کے روشن خیال طبقہ نے میرے موقف کو سمجھ لیا ہے۔ میری فوج پاکستان نواز ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ آپ ضروری فوج ریاست کی سرحدوں پر رکھیں تاکہ کسی بھی صورتحال کا مقابلہ کر سکے (دستخط ایم۔ اے گورمانی) گورمانی نے جو ۱۹۵۸ء میں مغربی پاکستان کے گورنر تھے ٹائمز آف کراچی کے ایڈیٹر اور حکیم سیف علی کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ قائم کر دیا۔ حکیم سیف علی فیروز خان نون کے ایک دوست تھے جنہوں نے مبینہ خط کی فوٹو اسٹیٹ ایڈیٹر کو فراہم کی تھی۔ مقدمہ کی کارروائی کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ فیروز خان نون نے حکیم سیف علی سے مبینہ فوٹو اسٹیٹ

ٹائمز آف کراچی" میں شائع کرانے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ ایک جعلسازی تھی اور عدالت نے فیروز خان نون کے خلاف سخت ریمارکس دیئے۔ تاہم اعلیٰ عہدوں پر فائز کچھ لوگوں کو یقین ہے کہ ایسا لیٹر موجود تھا لیکن گورمانی نے اُسے اس وقت ضائع کر دیا جب وہ وزیرِ مملکت تھے اور یہ جعلسازی حقائق کو بے نقاب کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ ایک دوسرا خیال یہ ہے کہ نون حکومت خان کی مسلم لیگی سیاست سے خوش نہیں تھی اور وہ اپنی ایک پہلے کی پشیمانی کا انتقام لے رہے ہیں۔ جب خان نے گورمانی کے مقدمہ ہتک عزت میں گواہی سے انکار کر دیا تھا۔

سہروردی ایک چالاک سیاست دان تھے۔ اگرچہ انہیں حکومت سے نکال باہر کیا گیا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے اپنے جانشین کے ساتھ اتحاد کر لیا۔ انہوں نے فیروز خان نون کو یقین دلایا کہ عام انتخابات کے بعد وہ نون کو صدر بنانے کی حمایت کریں گے۔ سہروردی نے بھی ایک مرتبہ یہ انکشاف کیا تھا کہ صدارت کے لئے متعدد امیدواروں کے نام ان کی جیب میں تھے۔

صدر اسکندر مرزا نے شاید یہ صحیح شبہ کیا تھا کہ سہروردی مشرقی اور مغربی پاکستان کے بڑے گروپوں کے درمیان سمجھوتہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ وزیراعظم نون کی حمایت کے علاوہ ایسا نظر آتا تھا کہ سہروردی کو دولتانہ سے بھی حمایت کی توقع ہے (پولیٹیکل سسٹم آف پاکستان صفحہ ۹۱-۹۰)

اسکندر مرزا اپنا کھیل کھیل رہے تھے۔ انہوں نے مغربی پاکستان میں گورمانی کو گورنر کے عہدہ سے علیٰحدہ کر دیا مرکزی کابینہ میں رد و بدل کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے ساتھ وہ آئین کو معطل کرنے کے بارے میں بھی سوچ رہے تھے، تاکہ اپنے مخالفین کو کچل سکیں جو مجوزہ انتخابات میں انہیں اقتدار سے علیٰحدہ کرنے کا عزم کئے تھے۔ ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو صدر نے یکے بعد دیگرے دو کابیناؤں سے حلف لیا۔ اسی رات جب ان کے وزراء گورنمنٹ ہاؤس میں پینے پلانے پارٹی میں مشغول تھے۔ صدر نے ایک فرمان جاری کر دیا جس میں ہموطنوں کو بتایا تھا کہ ملک کو بچانے کی خاطر انہوں نے مرکزی اسمبلی توڑ دی ہے، آئین معطل کر دیا ہے، اپنی کابینہ برطرف کر دی ہے اور کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کو اپنے ماتحت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا ہے۔ ۲۰ دن بعد کمانڈر انچیف نے مرزا کو مستعفی ہونے اور برطانیہ میں جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مرزا اپنی آمریت قائم کرنے کا پتہ کر چکے تھے۔ ان کے دوست فیروز خان نون جن کی کابینہ انہوں نے ۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء کو توڑی تھی اس بات کی گواہی دی ہے کہ اسکندر مرزا نے انہیں ایک یا دو بار یہ مشورہ دیا تھا اور مجھے کہا تھا کہ اگر میں یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ جمہوری طرزِ حکومت ہمارے ملک کے لئے موزوں نہیں تو مجھے مستعفی ہو جانا چاہیئے اور حکومت صدر کے حوالے کر دینا چاہیئے۔ جب انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کا وزیراعظم انتخابات کرانے پر تلا ہوا ہے تو ان کے پاس مجھے معزول کرنے کا واحد طریقہ یہ رہ گیا تھا کہ وہ آئین کو منسوخ کر دیں۔

اسکندر مرزا کے اے ڈی سی نے رات ساڑھے گیارہ بجے فیروز خان نون کو نیند سے بیدار کیا تاکہ ان کا پروانہ برطرفی انہیں دے سکے۔ جب فیروز خان نون نے انہیں انتظار کرنے کے لئے کہا کہ شاید جواب دینا پڑے۔ اے ڈی سی نے فوراً جواب دیا "جناب، اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا" اور وہ فوراً وہاں سے چلا گیا۔ اسکندر مرزا نے جو پروانہ برطرفی روانہ کیا تھا اس کا نفس مضمون درج ذیل ہے۔

ایوانِ صدر

کراچی

۷ر اکتوبر ۱۹۵۸ء

جناب من فیروز۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ملک اس وقت تک مستحکم نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں تمام ذمہ داریاں اور ایڈمنسٹریشن نہ سنبھال لوں۔ ۲۳ر مارچ ۱۹۵۶ء کا آئین نہ صرف قابلِ عمل نہیں بلکہ پاکستان کی سالمیت اور یکجہتی کے لئے بھی خطرناک ہے۔ اگر ہم اُسے آزمانے کی کوشش کرتے رہتے تو انہیں پاکستان کو خدا حافظ کہنا ہوگا اس لئے سربراہِ مملکت کی حیثیت میں، میں نے آئین منسوخ کرنے، تمام اختیارات سنبھالنے، اسمبلیاں، پارلیمنٹ اور مرکزی و صوبائی کابینائیں توڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے افسوس صرف اس بات کا کہ مجھے یہ انقلابی اقدام ایسے وقت کرنا پڑ رہا ہے جب آپ وزیراعظم ہیں۔ جس وقت یہ لیٹر آپ کو ملے گا، مارشل لاء نافذ ہو چکا ہوگا اور جنرل ایوب جنہیں میں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا ہے، پوزیشن میں آچکے ہوں گے۔ ذاتی طور پر میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں اور آپ کی ذاتی مسرت و بہبود کے لئے میں وہ سب کچھ کر دوں گا جو ضروری ہوگا۔

آپ کا مخلص

اسکندر مرزا

گذشتہ ۱۱ سال کے دوران متعدد سیاست دانوں اور مبصروں نے اس داستان کے پس منظر کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسکندر مرزا کے جانشین ایوب خان نے اپنے ہموطنوں کو بتایا کہ فوج میں میرے ساتھیوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اسکندر مرزا سے کہوں کہ وہ اقتدار فوج کے سپرد کر دیں۔ مرزا کا کہنا ہے کہ انقلاب وہ خود لائے تھے اور ۲۷ر اکتوبر ۵۸ء کو رضا کارانہ طور پر مستعفی ہوئے تھے۔ انہوں نے پاکستانی سیاستدانوں پر موقعہ پرستی، بدعنوانی اور اقربا پروری کا الزام لگایا ہے۔ ایوب خانؒ نے ان کے الزام کی تائید کی لیکن اس میں مرزا کو بھی معاف نہیں کیا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ ایوب خان نے مرزا کے عزائم پر شک کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مسلم لیگ کے صدر" قیوم خان نے مسلح افواج کے بعض افسروں سے رابطہ قائم کرنا شروع کر دیا تھا اور ہر قسم کی افواہیں اڑائی جا رہی تھیں تاکہ سینیئر افسروں کو الگ تھلگ کر دیا جائے اور فوجی افسروں کے گروپ پیدا کر دیئے جائیں جو ان کے عزائم کی تکمیل میں ان کی حمایت کریں (فرینڈز ناٹ ماسٹرز)

ہمیں ایوب خان کی ذاتی ڈائری میں سے حسب ذیل بامقصد نوٹس ملتے ہیں۔

۲۱ر مئی:۔

میں جہلم میں اترا اور اعظم (جنرل اعظم خان) سے ملاقات کی۔ انہوں نے ایک افواہ کے بارے میں بتایا جو ایبٹ آباد سے اڑائی گئی تھی کہ جنرل اور بریگیڈیئر گرفتار کر لئے گئے ہیں راولپنڈی میں میں نے کچھ اور افواہیں سنیں۔ میں نے ان کا اپنی بیوی سے ذکر کیا اور اس نے بتایا کہ وہ بھی ہر قسم کی افواہیں سنتی رہی ہیں۔ میری بیوی نے مجھے افواہوں کا خلاصہ بتایا جو یہ تھا کہ متعدد سینیئر افسروں پر بھارتی ایجنٹ ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔

۲۲ر مئی:۔

جنرل موسیٰ سے افواہوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ انہوں نے تحقیقات کی تھی اور یہ بات ظاہر ہوئی کہ یہ افواہیں ایبٹ آباد سے بعض سیاست دانوں نے اڑائی ہیں۔

بلاشبہ انتخابات نزدیک آ رہے ہیں۔ سیاستدان جائز یا ناجائز طریقے پر برسرِ اقتدار آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور برسرِ اقتدار آنے کے بعد وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان کے پاس پیش کرنے کے لئے اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ ملک کو مزید منتشر کرنے کے لئے کام کریں۔ اس صورت میں انہیں فوج اور میرا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس لئے وہ مجھے اپنا دشمن نمبر ایک سمجھتے تھے کیونکہ میں اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔ ان کا ضمیر اتنا مردہ تھا کہ وہ کچھ سیاسی فائدہ اٹھانے کے لئے فوج کو تباہ کرنے سے بھی باز نہیں آئیں گے جو ان کے پاس واحد ڈھال ہے۔

ایل ایف رش بروک ولیمز نے اپنی کتاب اسٹیٹ آف پاکستان، صفحہ ۱۸۲-۸۳ میں نشاندہی کی ہے کہ ایسی علامتیں موجود تھیں کہ شاید نوجوان آفیسر کوئی انقلاب برپا کریں۔

یہ جوان افسر کون تھے۔ نوجوان فوجی افسروں کا ایک

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

یحییٰ خان کے مجوزہ آئین کے اہم نکات

قوم یحییٰ خان کے اسلامی اور جمہوری آئین سے بال بال بچ گئی

نعیم الحسن



پاکستان کے حصے میں بہت ساری بدنصیبیاں آئیں، ان میں سے ایک بدنصیبی یحییٰ خان کو غیر قانونی صدارت تھی۔ اُس شخص کی غلط حکمتِ عملی اور سازشوں کی بدولت پوری قوم کو مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے عظیم المیئے سے دوچار ہونا پڑا۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۷۱ء کی رات کے آٹھ بجے قومی پروگرام میں یحییٰ خان نے شراب کے نشے میں دھت "باقیماندہ" پاکستان کے لئے ایک "خالص اسلامی" اور "جمہوری" آئین دینے کا اعلان کیا، آئین کا مسودہ دوسرے دن جاری ہونے والا تھا جس پر جماعت اسلامی نے بھی اپنی مکمل اور غیر مشروط حمائت کا ٹھپہ لگا دیا تھا۔ یحییٰ خان تو خیر ایک آمر اور بدنیت حکمران تھا جس نے اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے پاکستان کی سالمیت اور وقار کو داؤ پر لگا دیا، لیکن جماعت اسلامی تو ایک ایسی سیاسی پارٹی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ جو "جمہوریت" پر یقین رکھتی ہے، آخر وہ کس طرح ایک ایسے مطلق العنان ڈکٹیٹر کے تیار کردہ مسودۂ آئین کی غیر مشروط حمائت پر تیار ہو گئی جو اپنی سیاسی موت کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ دراصل یحییٰ خان کے آئین کے سلسلے میں جماعت اسلامی اور یحییٰ خان کے درمیان خفیہ گٹھ جوڑ ہو چکا تھا۔ یحییٰ خان نے آئین کے نفاذ کے بعد جماعت اسلامی سے اقتدار میں شرکت کا وعدہ کر لیا تھا۔ اسی یقین دہانی کے بل بوتے پر جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد نے پبلک پلیٹ فارم سے یحییٰ خان کے آئین کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اخبارات اس بات کی گواہی دیں گے۔ جماعت اسلامی اپنے اس سیاہ کارنامے سے مکر نہیں ہو سکتی۔ اگر یحییٰ خان اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو آج وہ جماعت اسلامی کے ذریعہ عوام کے سینہ پر مونگ دل رہا ہوتا۔ لیکن حالات نے اس بات کی اجازت نہ دی۔

یحییٰ خان کے مجوزہ آئین کے اعلان سے دس منٹ قبل انٹیلی جنس کے سربراہ آغا محمد علی (یحییٰ خان کے بھائی) نے ایوانِ صدر میں پہنچ کر اُسے قوم کے سامنے آئین پیش کرنے سے منع کیا۔ سزائے موت کے نشے میں ڈوبا ہوا یحییٰ خان چیخ اُٹھا۔ کیوں۔ کیوں۔؟ آغا محمد علی نے اُسے عوام کے جذبات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ "عوام کے جذبات جوالا مکھی کی طرح سُلگ رہے ہیں، کسی وقت بھی یہ آتش فشاں پہاڑ پھٹ سکتا ہے۔ عوام آپ کے پیش کردہ آئین قبول نہیں کریں گے۔ بغاوت اور ہنگاموں کا خطرہ بڑھ رہا ہے۔" یحییٰ خان اپنے بھائی کی باتیں سن کر سناٹے میں آگیا۔ حالات اس کے قابو سے باہر ہو چکے تھے۔ یحییٰ خان کے بعض قریبی حلقوں سے معلوم ہوا کہ اس نے اس معاملے میں جماعت اسلامی کی ہائی کمان سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم کیا، اور مسودۂ آئین کے اعلان کے بارے میں رائے طلب کی۔ جماعت کی ہائی کمان نے آغا محمد علی کی رپورٹ کی تصدیق کرتے ہوئے مسودۂ آئین پیش کرنے سے منع کر دیا۔ چنانچہ آئین کے اعلان کردہ وقت سے دس منٹ قبل قوم کے سامنے نام نہاد مسودہ آئین پیش کرنے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے

انٹیلیجنس رپورٹ پر
آئین کا اعلان روک دیا گیا

بعد حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہوتے، ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے بحیثیت صدر حلف اٹھایا اور یحییٰ خان کو اقتدار سے الگ ہونا پڑا۔

پاکستان کی تباہی کی ذمہ داری یحییٰ خان اور اس کے مشیروں پر عائد ہوتی ہے۔ وہ اپنے ملک اور قوم کے ساتھ مخلص نہ تھا۔ اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے مسلسل توڑ جوڑ اور محلاتی سازشیں کرتا رہا، جس کے نتیجے میں ملک کا بڑا حصہ علیحدہ ہونے پر مجبور ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد بھی اس کا نشہ ہرن نہ ہوا اور وہ بچے کھچے پاکستان پر اپنا جابرانہ تسلط برقرار رکھنے کے لئے فوج کے بعض جرنیلوں اور جماعت اسلامی سے ساز باز کر رہا تھا۔ اس کا دستوری مسودہ بھی اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔

اب آیئے ذرا اس آئین کی چند خاص خاص باتوں کو دیکھیں جو یحییٰ خان پیش کرنے والا تھا، اور جسے جماعت اسلامی کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی۔

(۱) مجوزہ دستور میں سلامی جمہوریہ پاکستان کے بنیادی نظریہ کا تحفظ اور فروغ۔

(۲) نظام حکومت وفاقی پارلیمانی ہوگا جس میں عوام کے بنیادی حقوق کی ضمانت دی جائے گی۔

(۳) ایک پاکستان کے دائرے میں رہتے ہوئے صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے گی۔

(۴) آئین عوام کے نئے سماجی اور اقتصادی تقاضوں کو پورا کرنے میں ایک مؤثر کردار ادا کرے گا۔"

وزیر اعظم

مرکز اور صوبوں میں عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل پارلیمنٹ ہوں گے۔ صدر پارلیمنٹ کی اکثریتی جماعت کے لیڈر کو بحیثیت وزیر اعظم منتخب کرے گا۔ دوسرے وزراء پارلیمان کے ارکان ہوں گے۔ اسمبلی کے ارکان کے علاوہ باہر سے بھی کسی شخص کو وزیر کے عہدے پر فائز کیا جاسکتا ہے لیکن اس کی مدت چھ ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔ کابینہ قومی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوگی۔ وزیر اعظم کو اس صورت میں ہٹایا جاسکتا ہے، جب وہ قومی اسمبلی میں اکثریت کی حمایت سے محروم ہو جائے۔

نائب وزیر اعظم

نائب وزیر اعظم، وزیر اعظم کے فرائض میں ہاتھ بٹائے گا۔ اگر وزیر اعظم ایک صوبے کا ہوگا تو نائب وزیر اعظم کا تعلق دوسرے صوبے سے ہوگا۔ اس طرح دونوں صوبوں (مشرقی اور مغربی پاکستان) کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔ صدر کونسل آف منسٹرز کے مشورے سے کام کرے گا۔ لیکن صدر ایسے مشوروں اور تجاویز پر عمل نہیں کرے گا جن سے اس کے اختیارات یا دفاعی افواج کے معاملات میں مداخلت کا پہلو نکلتا ہے۔

نائب صدر

دستور میں نائب صدر کے عہدے کی گنجائش رکھی جائے گی۔ اگر صدر ایک صوبے کا ہوگا تو نائب صدر کا تعلق دوسرے صوبے سے ہوگا اور جس کا ہیڈ کوارٹر ڈھاکہ میں ہوگا وہ سینٹ کا چیئرمین ہوگا۔ وفاقی ریاست میں دوسرے ایوان کی بھی گنجائش رکھی جائے گی۔ دوسرے ایوان میں صوبوں کو مساوی نمائندگی دی جائے گی۔ اسمبلی کے دوسرے ایوان میں منتخب نمائندوں کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ۱۵ ممتاز افراد نامزد کئے جائیں گے۔ جس میں سے ۱۰ افراد مشرقی پاکستان سے ہوں گے اور بقیہ ۵ افراد مغربی پاکستان سے ہوں گے۔

صدر اور نائب صدر کا انتخاب

صدر اور نائب صدر کا انتخاب "انتخابی ادارہ" کرے گا، جو سینٹ، قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے منتخب ارکان پر مشتمل ہوگا۔

اسمبلی

پاکستان کی اسمبلی، دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ لیکن قومی اسمبلی بنیادی قانون ساز اسمبلی ہوگی۔ سینٹ کو قومی اسمبلی کی منظور کردہ آئینی دفعات پر ویٹو کرنے کا اختیار حاصل نہ ہوگا۔ قومی اسمبلی ہی کسی قانون کو آخری شکل دے سکتی ہے۔ دستور میں کسی قانون کی تبدیلی پر اگر سینٹ کو اعتراض ہوگا تو اس صورت میں قومی اسمبلی اور سینٹ کا مشترکہ اجلاس ہوگا۔ اور کُل ارکان کی دو تہائی اکثریت سے آئینی ترمیمات کی جائیں گی اس کے علاوہ اس میں یہ بھی شرط ہوگی کہ دستوری یونٹوں کے کل ارکان کی ۲۵ فیصد تعداد آئینی ترمیمات کیلئے ضروری ہوگی۔

صوبائی خود مختاری سے متعلق اگر قومی اسمبلی کوئی بل منظور کرے گی تو اُسے سینٹ کے علاوہ صوبائی اسمبلیوں میں بھی بھیجا جائے گا تاکہ صوبائی یونٹیں اس بل کے بارے میں اپنی تجاویز دے سکیں۔ اس بل کے بارے میں صوبوں کے خیالات سینٹ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ سینٹ اس میں ترمیم و اضافہ کے بعد قومی اسمبلی اور صدر کی منظوری کے لئے بھیج دے گا۔ تنازعہ کی صورت میں دونوں ایوانوں کا مشترکہ اجلاس ہوگا۔ اگر بل کی منظوری میں صوبائی اسمبلیوں کی سفارشات کو نظر انداز کیا جائے گا تو صدر کو اس بات کا حق حاصل ہوگا کہ وہ بل کو نامنظور کردے۔ اس طرح زیادہ سے زیادہ صوبائی خود مختاری کو تحفظ دیا جائے گا۔

صوبائی اسمبلیاں

صوبائی اسمبلیاں عوام کے منتخب نمائندوں پر مشتمل ہوں گی ہر صوبے کا گورنر وزراء کے مشوروں اور تعاون سے اپنے فرائض ادا کرے گا۔ صوبائی اسمبلی کی اکثریتی جماعت کا لیڈر وزارت سازی کرے گا۔ اسمبلی میں اکثریت کی حمایت کھونے کے بعد اُسے عہدے سے ہٹایا جاسکتا ہے۔

آئین میں مرکز اور صوبوں کے تعلقات کے بارے میں خصوصی انتظامات کئے جائیں گے۔ بہت سارے اختیارات جو ابھی تک مرکز کے پاس ہیں انہیں صوبوں کو منتقل کر دیا جائے گا۔ مشرقی پاکستان کی خصوصی پوزیشن کے پیش نظر پوسٹ آفس، انشورنس، فیوچرز مارکیٹیں اور اسٹاک ایکسچینج جو ابھی تک مرکزی کنٹرول میں ہیں منتقل کر دیئے جائیں گے۔ مالی میدان میں بھی ٹیکسوں کی وصولی کے اختیارات صوبوں کو منتقل کر دیئے جائیں گے۔

اس کے علاوہ غیر ملکی تجارت، بیرونی امداد، صوبوں کے گرانٹ اور بین الصوبائی تجارت کے بارے میں یحییٰ خان نے اپنے دستوری خاکے میں کچھ نہیں کہا، ان امور پر اس نے آئندہ فیصلہ سنانے کا اعلان کیا۔

تین خود مختار ادارے، زرعی ترقیاتی کارپوریشن، اسمال

انڈسٹریز کارپوریشن، اور الیوسی ایٹیڈ سیمنٹ کمپنی صوبوں کو منتقل کر دیئے جائیں گے۔ جبکہ مغربی پاکستان میں ویسٹ پاکستان ریلوے، ویسٹ پاکستان پاور اینڈ ڈیویلپمنٹ اتھارٹی اور مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے علاوہ چند بنیادی صنعتیں جن کا تعلق مغربی پاکستان کے چار صوبوں سے ہے مغربی پاکستان ہی میں رہیں گی۔

صوبوں کو بیرونی جارحیت اور اندرونی خلفشار سے بچانے کی ذمہ داری مرکز ادا کرے گا۔ مرکز کے پاس اِس بات کا اختیار ہوگا کہ اگر وہ یہ سمجھے کہ صوبائی حکومت اپنے فرائض کو صحیح طور پر ادا نہیں کر رہی ہے تو سارے اختیارات گورنر کے سپرد کئے جا سکتے ہیں۔ ایسے حالات کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہوگی۔ دوئم، مالی عدم استحکام کی صورت میں مرکزی حکومت صوبوں کو کنٹرول کرے گی۔

ملک کی "سلامتی" اور "اتحاد" کو برقرار رکھتے ہوئے صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے گی۔ صوبائی ذرائع پیداوار پر صوبوں کا مکمل اختیار ہوگا۔ ریونیو جو مرکزی حکومت کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اس میں صوبوں کی شرکت کی گنجائش رکھی جائے گی تاکہ صوبے ذرائع پیداوار کو ترقی دے سکیں۔ انتہا پسند لیوی اور ٹیکس کے بارے میں کہتے ہیں کہ انہیں مرکز کے پاس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ صورتِ حال ناقابلِ تسلیم ہے اگر مالی خود مختاری صوبوں کے لئے ضروری ہے تو مرکز بھی اس کے بغیر اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر سکتا۔

چنانچہ اس معاملہ کو طے کرنے کے لئے دستور میں مندرجہ ذیل اختیارات صوبوں کو منتقل کئے جائیں گے۔

(الف) سیلز ٹیکس

(ب) پٹرولیم اور تمباکو مینوفیکچرز کے سِوا تمام ایکسائز ڈیوٹیاں۔

(ج) اسٹیٹ اینڈ لیکیسیشن ٹیکس۔

(د) عطیہ ٹیکس۔

مرکز کے پاس ٹیکسوں کے مندرجہ ذیل اختیارات ہوں گے۔

(الف) انکم ٹیکس، کارپوریشن اور دولت ٹیکس۔

(ب) پٹرولیم کی مصنوعات اور مینوفیکچرز تمباکو پر ایکسائز ڈیوٹی۔

(ج) ایکسپورٹ ڈیوٹی کے سوا کسٹم ڈیوٹی۔

صوبوں کو خصوصی گرانٹ

کم ترقی یافتہ صوبوں کو ہر سال ۲۰ کروڑ کی امداد دی جائے گی۔ اس میں سے ۶۰ کروڑ یا کل رقم جو مشرقی پاکستان میں کسٹم ڈیوٹی سے حاصل ہو گی، وہ مشرقی پاکستان پر خرچ کی جائے گی۔ سرحد اور بلوچستان کو کم سے کم پانچ پانچ کروڑ روپے کی امداد دی جائے گی۔

مرکز ٹیکسوں کی صورت میں مشرقی پاکستان سے ۱۳۰ کروڑ روپے سالانہ حاصل کرتا ہے۔ نئے آئین میں اس بات کے انتظامات کئے جائیں گے کہ اس میں سے ۱۰۰ کروڑ روپے مشرقی پاکستان کے ترقیات پر خرچ کئے جائیں گے۔ نئے آئین میں صوبائی ذرائع پیداوار کو مکمل تحفظ دیا جاتے گا۔ صوبے ہر سال مرکز سے قرض بھی حاصل کر سکتے ہیں، مرکز اس قرض کی رقم میں بتدریج اضافہ کرتا جائے گا۔

بیرونی امداد کا تعلق چونکہ ملک کی خارجہ پالیسی سے ہوتا ہے۔ اس لئے یہ شعبہ مرکز کے پاس رہے گا، ایک سال میں حاصل شدہ بیرونی امداد میں سے ۵۴ فیصد حصّہ مشرقی پاکستان کو مختص کیا جائے گا۔

کرنسی مرکز کے پاس رہے گی۔ آئین میں مشترکہ ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کو اپنا زرمبادلہ خرچ کرنے کا اختیار دیا جائے گا۔ صوبوں کو اس بات کا اختیار دیا جائے گا کہ وہ جمع شدہ زرمبادلہ کے پیشِ نظر برآمدات کو فروغ دینے کے پروگرام اور درآمدات کی پالیسیاں تیار کریں علاوہ ازیں چونکہ غیر ملکی تجارت کا تعلق بھی ملک کی خارجہ پالیسی سے ہے، اس لئے یہ شعبہ مرکز کے پاس رہے گا۔ ٹریڈ پالیسی مرکز بنائے گی۔ جس پر صوبوں کو عمل درآمد کرنا ہوگا۔

بین الصوبائی تجارت کے انتظامات تمام صوبوں کے نمائندے مشترکہ طور پر کریں گے۔ اس میں نصف ارکان کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہوگا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو ریجنل ریزرو بینک قائم کئے جائیں گے۔ ان علاقائی ریزرو بینکوں میں تمام صوبائی حکومتوں کو مکمل نمائندگی دی جائے گی۔ جو اپنے اپنے علاقوں کے کمرشل اور کوآپریٹو بینکوں کو کنٹرول کریں گی، اور قرضہ جات کی پالیسیاں مرتب کریں گی۔ صوبائی حکومتیں بیرونی اور داخلی ذرائع پیداوار کی روشنی میں ترقیاتی منصوبے تیار کریں گی۔

اسمبلیوں کے ارکان قانونی ڈھانچے کے مطابق بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کئے جائیں گے۔ صوبائی اسمبلیاں ایک ووٹ کی بنیاد پر سینٹ کے ارکان منتخب کریں گی۔ سابقہ دستور کے مطابق موجود اسلامی ادارے قائم رکھے جائیں گے اور ہر صوبے میں اسلامی تحقیقاتی ادارے بنائے جائیں گے، دستور میں اسلامی قوانین کو مؤثر بنائے جائیں گے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دارالخلافہ۔ اسلام آباد اور ڈھاکہ ہوگا، اسمبلی کی بنیادی سیٹ ڈھاکہ میں ہوگی۔

مثال رضوی

اِقبال

مِلّتِ بیضا کا مُحسن ایشیا کا فلسفی
منفرد تھا ذہن تیرا منفرد تھی تیری ذات
دے رہی ہے صبحِ صادق کا پتہ بانگِ درا
دے ہی دی آخر تدبُّر نے ترے مغرب کو مات
نُورِ آزادی سے روشن ہے جہانِ ایشیا!
شمس بن کر جگمگا اٹھا ہے تیرے دل کا داغ
کل بھی زندہ تھا جہاں میں آج بھی زندہ ہے تُو
آندھیوں میں جل رہا ہو جیسے اِک تنہا چراغ

سندھ کی پارلیمانی تاریخ کا ایک سنسنی خیز باب



میر غلام علی تالپور کو کھوڑو کے قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا

غلام محمد اور چوہدری محمد علی کا دور بھی عجیب دور تھا، عوام کے نام پر بابو حکومت کرتے تھے، اندیشہ شہر میں دُبلے ہوتے تھے۔ انہیں جمہوریت، ملکی اتحاد اور علاقائی ترقی کا غم ستاتا تھا چنانچہ ان مقاصد کے حصول کے لئے غلام محمد کے افسرانہ ذہن نے ون یونٹ کا خاکہ تخلیق کیا۔ چوہدری محمد علی نے اس کا منصوبہ تیار کیا اور مشتاق احمد گورمانی نے مشاطہ کا کردار ادا کیا۔ مرکزی وزیرِ تعلیم اور سندھ اسمبلی کے اسپیکر میر غلام علی تالپور نے ون یونٹ کے منصوبے کی مخالفت کی۔ وہ مرکزی کابینہ سے مستعفی ہو کر ۲ مارچ ۱۹۵۵ء کو حیدر آباد پہنچے۔ دوسرے دن سندھ اسمبلی کا اجلاس تھا۔ انہیں بحیثیت اسپیکر اجلاس کی صدارت کرنی تھی۔ اسمبلی کے اجلاس سے بارہ گھنٹے قبل حکومتِ سندھ نے انہیں "ایوب کھوڑو اور سندھ کے دیگر وزراء کے قتل" کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ۲۱ مارچ ۱۹۵۵ء کو حیدرآباد کے دربارِ ہال میں اس سیاسی ڈرامے کا آغاز ہوا جس میں میر غلام علی تالپور قیس عامری تھے، جو چاک گریبان میرپور خاص اور مٹھی میں صحرانوردی کر رہے تھے اور لیلیٰ وزارت کھوڑو کے پہلو میں عشوہ نوازیاں کر رہی تھی۔ اس ڈرامے کے ڈائریکٹر پیر علی محمد راشدی تھے۔ دربارِ ہال کے اس ڈرامے میں پیر علی محمد راشدی نے غلام علی تالپور پر الزام لگایا کہ انہوں نے سندھ کے وزیروں کو قتل کرانے کی ایک سنگین سازش تیار کی تھی۔ راشدی نے تالپور کے خلاف تحریکِ اعتماد پیش کی، اور اس طرح وہ اسپیکر کے عہدے سے برطرف کر دیئے گئے۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا،

میر غلام علی تالپور نے ۱۶ ستمبر ۵۵ء کو مرکزی اسمبلی میں تقریر کی، جس میں اپنی گرفتاری کے محرکات، اور کھوڑو اور راشدی کی عوام دشمنی اور بدعنوانیوں کی تفصیلات بیان کیں۔ یہ تقریر سندھ کے پارلیمانی دور کا ایک باب ہے چنانچہ میر غلام علی تالپور کی تقریر کا متن نذرِ قارئین ہے (ادارہ)



علی محمد راشدی



ایوب کھوڑو

جنابِ عالی! میری بڑی آرزو ہے کہ مسٹر کھوڑو آج اس ایوان میں خود بھی موجود ہوتے تاکہ تمام حقائق، متعلقہ فرد کی زبانی سنتے اور یہی وجہ ہے کہ میں، اس ایوان میں کھڑا ہوں تاکہ سندھ کے المناک حالات کی روح فرسا حکایت، جناب کھوڑو کے گوش گزار کر دوں، اور بالخصوص یہ بتا دوں کہ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے ان کے دورِ اقتدار میں جھوٹے اور بے بنیاد مقدمات کا سلسلہ کس طرح قائم ہوا۔

اسپیکر:۔ وہ مقدمے کسی عدالت میں زیرِ سماعت تو نہیں؟

میر غلام علی تالپور:۔ جی نہیں جناب۔

"مسٹر کھوڑو نے اپنی مدافعت کرتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں میرے خلاف اور میرے بعض ساتھیوں یعنی سابق وزرائے اعلیٰ قاضی فضل اللہ اور پیر الٰہی بخش، پیرزادہ عبدالستار اور دوسرے اراکینِ اسمبلی اور دیگر معزز حضرات کے خلاف اس مقدمۂ سازش کا کوئی علم نہیں۔ ہم سب پر مسٹر کھوڑو کو قتل کرنے کی سازش کا الزام لگایا گیا ہے۔ جنابِ عالی اگر مجھے اجازت دی جائے، تو عرض کروں کہ ہم نے مسٹر کھوڑو کو قتل کرنے کی سازش نہیں کی تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مسٹر کھوڑو نے مجھے ہلاک کرنے کی سازش کی تھی۔

(شرم۔ شرم کی آوازیں)

جنابِ عالی! آپ کو علم ہے کہ میں دل کا اور بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ بمشکل چند ماہ پہلے میں بیماری سے اٹھا تھا لہٰذا مجھے زیادہ بات کرنے یا زیادہ چہل قدمی کرنے حتیٰ کہ طویل سفر کرنے کی بھی اجازت نہ تھی مجھے علم نہیں کہ وہ سازش کیا تھی جس نے مسٹر کھوڑو کے ذہن میں جنم لیا۔ جنابِ عالی! ۱۸ مارچ ۱۹۵۵ء تک میں ایک معزز آدمی تھا، اور مرکزی کابینہ کا وزیر تھا۔ لیکن سندھ کی سیاست میں حصہ لینے کی غرض سے ۱۸ مارچ کو میں جونہی مستعفی ہوا، حالانکہ میں سندھ کی قانون ساز اسمبلی کا اسپیکر بدستور تھا، میں نے مسٹر کھوڑو کے قتل کی سازش کر ڈالی، چنانچہ ۲۰ مارچ ۱۹۵۵ء کو حیدر آباد کے قریب کوٹری کے تھانہ میں میرے خلاف تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۳۰۲ بشمول ۱۲۰ بی کے تحت مقدمہ درج کر لیا گیا۔ یہاں میں یہ عرض کرتا چلوں کہ سندھ کی سیاست میں میری شرکت کا مقصد صوبے کے عوام کو مسٹر کھوڑو کی منتقم مزاجی، دہشت گردی اور تشدد سے نجات دلانا تھا۔

(حزبِ اختلاف سے شرم، شرم کی آوازیں سنائی دیں)

سی آئی ڈی کو سازش کی خبر نہیں

یہ شکایت ضلع حیدر آباد میں رجسٹر نہیں کی گئی جہاں یہ سازش تیار کی گئی تھی۔ بلکہ دریا پار ایک دوسرے ضلع میں رجسٹر کی گئی۔ جنابِ عالی! صرف یہی نہیں کہ یہ شکایت کوٹری پولیس اسٹیشن میں رجسٹر کی گئی بلکہ ایسے تمام افسروں کو جو ان کی راہ میں حائل ہو سکتے ہوں، راستے سے ہٹانے کی تیاریاں پہلے ہی کر لی گئیں اور ان تمام ایماندار اور محتاط عہدیداروں کو، جن سے یہ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ وہ مجرمانہ ریشہ دوانیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالیں گے، فی الفور ریٹائر کر دیا گیا۔ ایک شخص تھے مسٹر عبدالعزیز سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس جو سی آئی ڈی کے انچارج تھے۔ کسی وجہ یا جواز کے بغیر ۱۹ مارچ کو اس ایماندار افسر کا اچانک تبادلہ کر دیا گیا اب یہ پوچھئے کہ انہوں نے کس وقت اپنے عہدے کا چارج دیا؟ انہوں نے ۱۹ مارچ کو رات گئے ایک جونیئر پولیس افسر مسٹر غلام نبی فاروقی کو اپنے عہدے کا چارج دیا۔ جنابِ عالی! مسٹر عبدالعزیز کو جو وہاں دو سال سے تعینات تھے اس "سازش" کا کوئی علم نہیں تھا، اور نہ انہوں نے حکومت کو رپورٹ دی تھی۔ اس سے زیادہ حیرت کی بات ہے کہ مرکزی حکومت کی سی آئی ڈی کو بھی "سازش" کا کوئی علم نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھ و مرکز کی سی آئی ڈی دونوں اس پوزیشن میں ہیں کہ انہیں سازش کا علم بہتر طور پر ہوتا۔ کیا مسٹر کھوڑو اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا کوئی منصوبہ تھا؟ جنابِ عالی! مسٹر عبدالعزیز نے مسٹر کھوڑو کے احکام کی تعمیل سے انکار کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ شکایت درج کرانے سے ایک روز پہلے ہی ان کا فوری طور پر تبادلہ کر دیا گیا۔ میرے پاس سرکاری گزٹ ہے جس میں ان کے تبادلہ کی تاریخ اور وقت درج ہے اور ان کی جگہ کسی شخص کو لایا گیا۔ قائم مقام ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر غلام نبی فاروقی کو جو صرف انسپکٹر آف پولیس تھے، سازش کیس تیار کرنے کے بعد انہیں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدہ پر مستقل کر دیا گیا۔ اور سی آئی ڈی کا چارج انکے سپرد ہوا۔ کیونکہ انہوں نے مسٹر کھوڑو کیلئے یہ گھناؤنی حرکت کی۔

مسٹر اسپیکر۔ معزز ممبر کو ایسے افسروں کا تذکرہ نہیں کرنا چاہیئے جو یہاں اپنی صفائی پیش کرنے کے موقف میں نہ ہوں۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ ان کے نام لئے بغیر اپنا نقطۂ نظر اختصار سے بیان کریں۔

مسٹر غلام علی خان تالپور۔ جنابِ والا! مسٹر ایم۔ اے کھوڑو جو صوبہ کے وزیرِ اعلیٰ ہیں اس ایوان میں موجود ہیں، وہ ان عہدیداروں کا دفاع کر سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ کل کے مباحثے کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو یہ علم ہو جائے گا کہ انہوں نے ان کی مدافعت کی ہے اور اپنی تقریر میں ان کا ذکر کرتے ہوئے انہیں "فرشتے" قرار دیا ہے۔

ون یونٹ کی قرارداد پاس کرانے کے لئے سندھ اسمبلی کے اسپیکر کو اغوا کر لیا گیا

مسٹر اسپیکر۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، انہوں نے اس کا تذکرہ مسٹر سہروردی کے جواب میں کیا ہے۔

مسٹر غلام علی خان تالپور۔ میں آپکے فیصلے کی پابندی کروں گا۔ اور نام لیکر ان کا ذکر نہیں کروں گا۔

مسٹر ایچ۔ ایس۔ سہروردی۔ نہیں جناب ان کا ذکر بہت ضروری ہے۔ مسٹر کھوڑو کے بیانات صحیح نہیں لہٰذا ان کے ناموں کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ آرڈر۔ آرڈر۔

مسٹر ایچ۔ ایس۔ سہروردی۔ میں نے کہا ہے "بیانات صحیح نہیں"۔ "جھوٹا" نہیں کہا۔

مسٹر اسپیکر۔ مسٹر سہروردی اپنی نشست پر تشریف رکھیں اور میر غلام علی خان تالپور کی تقریر میں مداخلت نہ کریں۔

مسٹر سہروردی۔ وہ بیانات صحیح نہیں تھے۔ یہ بات میں آپ کو بھی بتانا چاہتا ہوں۔

میر غلام علی خان تالپور۔ جنابِ عالی میں ایک خاص افسر کا تذکرہ کر رہا تھا۔ جس کا ۱۹ مارچ کی شام کو تبادلہ کر دیا گیا اور اسے اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل سی آئی ڈی بنا دیا گیا۔ اس افسر کو ۱۹ مارچ کو کافی رات گئے پہلی مرتبہ سازش کا علم ہوا۔ ۲۰ کی صبح کو وہ حیدر آباد گیا اور دفعہ ۳۰۲ معہ دفعہ ۱۲۰ بی کے تحت کوٹری پولیس اسٹیشن میں کیس رجسٹر کیا۔ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس سی آئی ڈی کو محض ایک خط لکھ کر بغیر وارنٹ میری گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، ۲۰ مارچ کی رات کو، تقریباً دس بجے میرے بنگلے پر آئے میں اس دن سندھ قانون ساز اسمبلی کے اسپیکر کی حیثیت سے اسمبلی ہال گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے نشستوں کا انتظام کیا۔ اور گیلری کے پاسوں کے انتظامات کئے لیکن شام کو مجھے مسٹر کھوڑو کے راستے سے ہٹانے کے لئے بغیر وارنٹ کے گرفتار کر لیا گیا اور میں واحد شخص تھا، جسے (شرم، شرم کی آوازیں) صرف ایک خط پر جو میرے نام نہیں، بلکہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے نام تھا، اس بنیاد پر کہ میرے خلاف کافی مواد فراہم ہو گیا ہے، دفعہ ۳۰۲ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ جنابِ عالی، قواعد و ضوابط کے مطابق مسٹر کھوڑو کو پہلے ہز ایکسی لینسی گورنر سندھ سے مطالبہ کرنا چاہیئے تھا کہ میں سندھ قانون ساز اسمبلی کی اسپیکر شپ سے مستعفی ہو جاؤں، تب مجھے گرفتار کرنا چاہیئے تھا۔

"میں نے کھوڑو کو قتل کر دیا"

جنابِ عالی! یہ دفعہ ۳۰۲ کیا ہے؟ یہ دفعہ کسی شخص کے خلاف ارتکابِ قتل کے جرم سے متعلق ہے یعنی قتل کا جرم عملاً سرزد ہو چکا ہو۔ گویا میں نے مسٹر کھوڑو کو قتل کر دیا تھا۔ لہٰذا



یہ چنگیز اور ہلاکو کی حکومتوں سے بدتر حکومت ہے

مجھے اس دفعہ کے تحت ملزم گردانا گیا۔ یہ لوگ مجھے میرپورخاص سے کوئی پچاس میل آگے لے گئے۔ میں وہاں ۱۲ بجے رات کو پہنچا۔ رات میں نے وہیں گزاری۔ انصاف کا تقاضہ یہ تھا کہ مجھے دوسرے دن کسی مجسٹریٹ کے سامنے ریمانڈ کیلئے پیش کیا جاتا کیونکہ اس وقت تک ۲۴ گھنٹے کی مدت ختم ہونے والی تھی۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ مجھے میرپورخاص سے کسی نامعلوم جگہ بھیج دیا یہ الفاظ میرپورخاص کے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہیں کہ "ہمیں نہیں معلوم کہ ہم آپ کو کہاں لئے جا رہے ہیں۔ ہم آپ کو ایک نامعلوم جگہ پر لے جا رہے ہیں۔"

جناب عالی! اس وقت صبح کے آٹھ بجے تھے، میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "آپ کو میری حالت کا علم ہے۔ میں دل کا مریض ہوں، مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ میں دھوپ کی تپش میں چلنے کے قابل نہیں۔"

جناب عالی! یہ مارچ کا مہینہ تھا۔ اس زمانہ میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ وہ ۱۱ بجے میرے پاس آئے اور مجھے ایک پولیس ٹرک میں لے گئے۔ کار میں نے فراہم کی تھی۔ ان کے پاس ایک دو جیپیں تھیں میرے آگے پیچھے تیس چالیس کانسٹیبل تھے۔ اور دو یا تین افسر کار میں میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے یہ سارا فاصلہ انتہائی اعصابی کرب میں گزارا۔ میرے اپنے آدمیوں کو علم تھا کہ میں کس راستے سے گزروں گا۔ وہ گاؤں یا قصبہ کے قریب سڑک کے کنارے آتے تھے۔ انہوں نے مجھے چائے، ٹھنڈا پانی، اور دن کا کھانا مہیا کیا۔ میں نے یہ پورا راستہ طے کیا اور رات کو ٹھیک ۱۲ بجے ایک گاؤں میں پہنچا، جو میٹھی کے نام سے موسوم ہے۔

اس گاؤں میں کبھی کوئی نہیں آیا

اس گاؤں میں اس وقت تک کوئی دورہ کرنے والا افسر نہیں پہنچا تھا۔ وزیروں کا تو کیا ذکر ضلع کلکٹر بھی جس کے دائرہ اختیار میں یہ گاؤں ہے یہاں کبھی نہیں آیا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ میرے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔ وہ لوگ یہی طے نہ کر سکے کہ مجھے سب جیل کی کوٹھری میں رکھیں یا ڈاک بنگلہ میں لے جائیں۔ اس ڈاک بنگلہ میں اب تک کوئی شخص نہیں آیا تھا۔ اس لئے ایک طویل عرصے سے یہ بغیر مرمت بند پڑا تھا۔ وہاں سانپ بچھوؤں کا بھی خطرہ تھا۔ لہٰذا وہ مجھے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کے مکان پر لے گئے۔ اس مکان کا حال یہ تھا کہ ایک متروکہ جائیداد تھی۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس گزشتہ تین مہینے کے عرصہ میں جب سے اس کا تبادلہ ہوا ہے، یہاں پہلی مرتبہ آیا تھا۔ اور بس ایک دن ٹھہرا تھا۔ اس مکان کی بھی مرمت نہیں ہوئی تھی۔

میں نے رات اسی مکان میں گزاری۔ دوسرے دن مجھے ڈسٹرکٹ بنگلہ میں منتقل کر دیا گیا۔ میں وہاں طبی امداد کے بغیر تین دن تک رہا۔ مختار کار یا تحصیلدار نے کلکٹر کو تار دیا کہ میرے لئے وہاں طبی امداد مہیا نہ تھی۔ نہ دوائیں تھیں، نہ ڈاکٹر۔ ایک ہی ڈاکٹر تھا جو چند روز پہلے چھٹی پر چلا گیا تھا اور جب تک میں وہاں رہا، واپس نہیں آیا تھا۔ تین دن بعد ایک میڈیکل افسر معائنہ کرنے آیا۔ وہ بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اس کے پاس کوئی دوا نہ تھی۔ حتیٰ کہ میرے پیشاب کا معائنہ کرنے اور اس میں شکر کی کیفیت معلوم کرنے کے لئے بھی کوئی دوا نہ تھی۔ اس نے میرپورخاص کے سول سرجن کو دواؤں کیلئے تار بھیجا۔ سول سرجن بذاتِ خود آیا۔ مجھ سے ملا۔ اور میرے ساتھ پوری رات قیام کیا۔ اب مجھے ۱۰۲ یا ۱۰۳ ڈگری بخار رہنے لگا تھا۔ کسی شخص نے نہ تو میری نبض دیکھی اور نہ خون کا دباؤ معلوم کیا۔ یقین ہے کہ اس وقت میرے خون کا دباؤ بہت زیادہ رہا ہو گا۔ شاید ان لوگوں نے اربابِ اختیار کو بتا دیا تھا کہ میری حالت ٹھیک نہیں ہے اور وہاں مجھے زیادہ دنوں تک رکھنا خطرناک ہو گا۔ پانی بھی اس جگہ کا بہت خراب تھا۔ غذا دستیاب نہیں تھی۔ گرد و پیش ریت کے تودے تھے۔

جناب عالی! یہ گاؤں پاکستان اور ہندوستان کی سرحد پر ایک وادی میں واقع ہے جہاں چاروں طرف ریت کے ٹیلے ہیں، جو وہاں کے مکانوں سے بھی اونچے ہیں۔

۲۴ مارچ کو مجھے میرپورخاص منتقل کر دیا گیا۔ اب میں اتنا ہی فاصلہ طے کر کے میرپورخاص لایا گیا۔ وہاں میں پانچ بجے شام کو پہنچا۔ یہ سارا فاصلہ میں نے دن کے انتہائی گرم حصے میں طے کیا تھا۔ ۲۴ مارچ کی شام کو مجھے ایک روز کے لئے سرکٹ ہاؤس میں ہی رہنے دیا گیا۔ دوسرے دن رات کو تقریباً دس بجے ٹھر پارکر کے کلکٹر مجھ سے ملنے آئے۔

کلکٹر کی خوشخبری، پولیس کا چھاپہ

جناب عالی! میں یہاں ایک بات عرض کرنا بھول گیا۔ جب مجھے میٹھی منتقل کیا گیا تو اس وقت مجھے حراست میں نہیں لیا گیا تھا۔ مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ پبلک سیفٹی ایکٹ غنڈوں اور بدکردار لوگوں کے لئے ہے۔ میرپورخاص کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت صرف اپنے ضلع کے بدکردار لوگوں کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر سکتا ہے۔ جناب عالی! میں گزشتہ دو سال سے ضلع میں نہیں گیا تھا۔ مجھے غنڈہ قرار دے دیا گیا اور مجھے ضلع کے امن و سکون کیلئے خطرہ تصور کیا گیا، چنانچہ سیفٹی ایکٹ کے تحت مجھے گرفتار کر لیا گیا۔

۲۴ کی شام کا واقعہ سنیئے۔ ۱۰ بجے رات کو میں سرکٹ ہاؤس میں بیٹھا ہوا تھا کہ کلکٹر میرے پاس آئے اور کہنے لگے میں آپ کو ایک خوشخبری سنانے آیا ہوں کہ "آپ کے خلاف وارنٹ گرفتاری واپس لے لیا گیا ہے۔ وہ حالات جن کے تحت آپ کی گرفتاری ضروری تھی، اب موجود نہیں رہے۔ لہٰذا آپ ایک شریف انسان ہیں اور آزاد ہیں۔"

میں نے کلکٹر سے کہا۔ "اس وقت رات کے دس بجے ہیں، فرمایئے کوئی اور سازش تو میرے خلاف نہیں ہے؟"

انہوں نے جواب دیا "مجھے کوئی علم نہیں۔ جہاں تک سیفٹی ایکٹ کا تعلق ہے وارنٹ واپس لے لیا گیا ہے۔ اب آپ آزاد ہیں اور جہاں چاہیں جا سکتے ہیں۔"

میرپورخاص کے کلکٹر ۱۰ بجے رات کو یہاں سے رخصت ہوئے۔ ان کے جاتے ہی تقریباً دس کانسٹیبلوں کے ساتھ میرپورخاص کے سپرنٹنڈنٹ پولیس آ پہنچے۔ اور کہا "ہمیں بڑا افسوس ہے کہ آپ کو دفعہ ۳۰۲ بشمول ۱۲۰ (ب) کے تحت دوبارہ گرفتار کیا جاتا ہے۔ آپ کو سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جائیگا۔"

پولیس افسر کی آنکھیں بھر آئیں

دوسرے دن صبح کو مجھے ایک جگہ لے جایا گیا جو اس جگہ سے کچھ دور تھی۔ میرپورخاص سے اس کا فاصلہ ۷۰، ۸۰ میل تھا۔ مجھے ٹانڈو کے سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس سے پہلے والی رات کو میں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس سے درخواست کی تھی کہ مجھے کچھ دیر سو لینے دو۔ دوسرے دن صبح لے جانا، کیونکہ میں بالکل خستہ اور درماندہ ہو رہا ہوں۔ جناب عالی! میں رات کو خواب آور گولی استعمال کرتا ہوں۔ تاکہ مجھے اچھی نیند آ سکے۔ میری درخواست مان لی گئی اور مجھے دوسرے دن ۲۶ کی صبح کو لیجایا گیا۔ اور سب ڈویژنل مجسٹریٹ ٹانڈو کے سامنے پیش کیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کوئی معقول آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے کہا اچھا میں آپ کو کل صبح لے جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح ہم روانہ ہوئے۔ پولیس کے ٹرک میرے آگے پیچھے تھے۔

سی آئی ڈی کا سپرنٹنڈنٹ پولیس اور انسپکٹر اور دوسرے اضلاع کے ایس۔ پی سب کے سب وہاں موجود تھے۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس، رائفل بردار کانسٹیبل اور انسپکٹر میرے ساتھ ایک ہی کار میں تھے۔ ہم ۱۰ بجے پہنچے۔ ہماری روانگی کی خبر تیزی سے پھیل گئی۔ وہ گاؤں میرے گاؤں کے قریب ہی واقع تھا۔ ہزاروں آدمی وہاں پہنچ گئے اور میرے کھانے کا بھی انتظام کیا گیا۔ مجھے اپنے میرپور خاص سے ایک سول سرجن کو گاؤں لے جانیکی اجازت دیدی گئی۔

جناب عالی! اس سب ڈویژنل مجسٹریٹ کی بڑی مہربانی تھی کہ اس نے فوراً مجھے جوڈیشنل کسٹوڈی میں دے دیا۔ مجھے حیدرآباد بھیج دیا گیا۔ اس نے مجھے ایک یا دو گھنٹے کیلئے سونے کو چارپائی اور اپنا بستر بھی عنایت کیا۔ اور پھر ہم روانہ ہو گئے۔ ہم نے یہ فاصلہ دوبارہ دن کے انتہائی گرم حصے میں طے کیا۔ ہم کوئی ڈھائی یا تین بجے جیل پہنچے۔ جناب عالی یہاں درجۂ حرارت ۱۰۴ ڈگری تھا۔ اور میں واقعی بہت پریشان تھا کہ میری صحت کا کیا ہوگا۔ میں جیل سے مطلق خائف نہیں تھا کیونکہ میں نے یہ خیال دل سے نکال دیا تھا کہ میرا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے ہے، نیز یہ کہ میں ان سختیوں کو برداشت نہیں کر سکتا، جن میں مجھے ڈالا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں ایک عام آدمی ہوں جس نے اپنی زندگی بنی نوع کی خدمت اپنے عوام اور اپنے صوبے کے لئے وقف کر دی ہے۔ ۱۹۳۷ء سے یعنی سندھ کی علیحدگی کے پہلے دن سے میں سندھ اسمبلی کا ممبر رہا ہوں۔ اور آج آپ مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔

جیل میں حالت خراب ہو گئی

جناب عالی! مجھے جوڈیشنل کسٹوڈی میں دیدیا گیا۔ جیلر نے میرا معائنہ کرنے کے لئے تین یا چار ڈاکٹروں کا ایک بورڈ بلایا۔ اور ان سب نے فیصلہ کیا کہ وہ اس قیدی (مجھے) کو اس جیل میں رکھے جانے کی اجازت دینے کی ذمہ داری قبول نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ مر جائے اور اس کی موت ان کے گلے پڑ جائے ــــ اسی اثناء میں میرے ایڈووکیٹ نے ڈسٹرکٹ کورٹ میں ضمانت کی درخواست دی۔ ضمانت کی درخواست خرابی صحت کی بنیاد پر دی گئی تھی۔ سول سرجن کا سرٹیفکیٹ بھی درخواست کے ساتھ منسلک تھا، اور جیل کے ارباب اختیار کا سرٹیفکیٹ بھی ساتھ ہی تھا کہ میں بیمار ہوں اور مجھے ضمانت پر رہا کیا جائے۔ لیکن ڈسٹرکٹ جج نے میری ضمانت کی درخواست اس بنا پر مسترد کر دی کہ ضمانت کی درخواست پہلے سب ڈویژنل مجسٹریٹ کے پاس کیوں

سرکاری لائنو ٹائپ مشین کھوڑو کے قبضہ سے برآمد ہوئی

نہیں پیش کی گئی۔ لہٰذا میں ضمانت منظور نہیں کرونگا مجھے جیل کی کسٹوڈی میں دے دیا گیا۔

اب مجھے جیل جانا تھا۔ میری حالت اور زیادہ خراب ہو گئی۔ بعد میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خواہش ظاہر کی کہ وہ صحت کی بنیاد پر ضمانت منظور کریں گے۔ حالانکہ پہلے صحت کی بنیاد پر ضمانت منظور کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ جیل کے ارباب اختیار نے لیاقت میڈیکل کالج سے قلبی امراض کے ایک ماہر ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس نے میرا معائنہ کیا۔ میں صاحب فراش تھا۔ مجھے جیل میں اے کلاس دی گئی۔ قیدیوں نے میرے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ مجھے بہت اچھی چائے اور بسکٹ دیئے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جیل میں میرا بہت زیادہ خیال کیا گیا۔ ان چار یا پانچ دنوں کے مقابلے میں جب میں ایک جگہ سے دوسری جگہ فٹ بال کی طرح لڑھکتا رہا، میں وہاں بہت اچھی طرح رہا۔ غروب آفتاب کے وقت جیل کے ارباب اختیار میرے پاس آئے اور مجھ سے درخواست کی کہ خدا کیلئے آپ ابھی یہاں سے چلے جایئے کیونکہ آپ کی ضمانت کی درخواست جو پہلے مسترد ہو گئی تھی، منظور ہو گئی ہے۔ ایک افسر نے کہا، آپ کو شخصی ضمانت پر رہا کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے کہا۔ میں آرام سے ہوں، مجھے چند روز تک یہاں مکمل آرام کر لینے دیجئے۔ انہوں نے کہا نہیں، میں یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہیں۔ کیوں کہ کسی وقت بھی آپ کا انتقال ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میں جیل سے باہر آیا اور اپنے بنگلہ پر گیا۔ سندھ کے ڈائریکٹر صحت مسٹر بیٹو مجھ سے ملنے آئے۔ میں نے دوسرے ڈاکٹروں کو بھی بلوایا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ چونکہ یہاں آپ کے ملاقاتی کثرت سے آتے ہیں اور بہت سے لوگ باہر جمع ہو گئے ہیں۔ لہٰذا آپ کو اس حالت میں کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دیجائیگی۔ ہمارے خیال میں آپ کراچی چلے جائیں۔

جناب عالی! میں دوسرے دن صبح ایک اسٹیشن ویگن میں کراچی روانہ ہو گیا۔ یہ سفر طے کرنے میں سات گھنٹے لگے۔ میں کراچی پہنچ گیا۔ اور تقریباً ڈھائی ماہ مہینے تک صاحب فراش رہا۔

جناب عالی! اب کیا مسٹر کھوڑو میں یہ جرأت اور اہلیت ہے کہ وہ اس معزز ایوان کے سامنے کہیں کہ یہ مقدمہ سچا ہے۔ اور پولیس نے جو کچھ کیا ان کے علم کے بغیر کیا۔ پولیس نے عام طریقے پر رپورٹ درج کی اور پولیس تفتیش کر رہی ہے۔ سابقہ شب میں وزیروں کے بیانات جاری ہوئے کہ ایک سازش کا پتہ چلا ہے۔ ان بیانات کے بعد سندھ اسمبلی کے ایوان میں اعلان کیا گیا کہ سازشیوں کے خلاف سخت کارروائی کی جا رہی ہے۔

جناب عالی! میری خوش نصیبی تھی کہ میں ۱۲ مارچ کو شاہ اردن کی شکار پارٹی کا ایک رکن تھا۔ میں مرکزی حکومت میں وزیر تعلیم تھا۔ اور جانے پر آمادہ نہیں تھا مگر شاہ اردن کو کچھ اچھی بندوقیں چاہیئں تھیں۔ میرے پاس بعض اچھی بندوقیں ہیں۔ اس وقت کے وزیر اعظم نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی بندوقیں لیکر اس پارٹی کے ساتھ جاؤں، کیونکہ شاہ اردن میری بندوقیں استعمال کریں گے۔

شاہ اردن کی شکار پارٹی

جناب عالی! میرے لئے وہاں کوئی نشست خالی نہیں تھی۔ میں اپنی سیلون بھی ٹرین میں لگانے کے لئے کہہ سکتا تھا، مگر وقت بالکل نہیں تھا اور اسپیشل ٹرین بہت لمبی ہو چکی تھی۔ لہٰذا میں نے ہز ایکسی لینسی گورنر سندھ سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے سیلون میں ایک نشست دے دیں۔ ہم لوگ رات ۱۱ بجے کراچی سے روانہ ہوئے اور تقریباً ۵، ۶ بجے صبح وہاں پہنچے۔ جناب عالی! ابتدائی رپورٹ میں کیا لکھا گیا ہے کہ ۱۲، ۱۳ کی درمیانی شب کے شروع اوقات میں میں اپنے سیلون سے باہر آیا جہاں سخت پہرہ تھا۔ آپ کو علم ہے کہ جب وزیر اعظم باہر جاتے ہیں تو پہرہ ہوتا ہے۔ آپ خود تصور کر سکتے ہیں کہ جب بادشاہ سفر کر رہا ہوگا تو پہرہ کتنا سخت ہوگا۔ اسپیشل ٹرین کے چاروں طرف پولیس کے تین حفاظتی دستے تھے اور کوئی شخص ان معززین کے آس پاس ایک میل تک نہیں جا سکتا تھا۔ لہٰذا مفروضہ طور پر میں چار اور پانچ بجے کے درمیان اپنا سیلون چھوڑ کر بنگلہ پر گیا جہاں میں نے ان تمام افراد کو بلایا جنہوں نے میرے خلاف گواہی دی ہے اور ان سے کہا کہ آج ہی موقع ہے شاہ اردن آ رہے ہیں۔ کوئی پولیس یا افسر موجود نہیں ہوگا، اور مسٹر کھوڑو وہیں ہوں گے۔ آپ لوگ وہاں جائیں اور شکار گاہ میں جہاں شاہ اردن تیتر کا شکار کریں گے، مسٹر کھوڑو کو قتل کر دیں۔ اور یہ من چلے مسٹر کھوڑو پر گولی چلانے کے لئے وہاں پہنچ گئے۔

جناب عالی! میں نے اس کے بعد کیا کیا؟ میں نے ان میں سے ہر ایک کو ہزار روپے دیئے۔ یہ نوٹ دس دس

سازش کیس تیار کرنے والے پولیس افسر کو ترقی دیدی گئی

روپے کے تھے یا غالباً سو سو روپے کے ہرے نوٹ تھے۔ جس جگہ سے گولی چلائی تھی میرے آدمیوں نے اس جگہ سے دو میل پہلے ہی بندوقیں اور کارتوس فراہم کئے تھے۔ سورج نکلنے بلکہ جھٹ پٹا ہونے سے پہلے یہ لوگ مسٹر کھوڑو پر گولی چلانے کے لئے بندوقوں اور کارتوسوں سمیت ایک جھاڑی میں جا کر چھپ گئے۔ ہانکا کرنے والے تیتروں کو شاہ کی طرف ہانک کرلے گئے۔ اور یہ لوگ مسٹر کھوڑو کو ہلاک کرنے کے لئے چھپ کر بیٹھے رہے۔ ان سے توقع تھی کہ اس مقام پر وہ کھوڑو پر گولی چلائیں گے۔ جناب عالی انہیں گولی چلانے کا موقع ہی نہیں ملا، اور وہ واپس آگئے۔ ان کو میرے آدمیوں نے، میں نے نہیں، برا بھلا کہا۔ جس شخص نے انہیں برا بھلا کہا تھا وہ بھی میرا شریک جرم ہے۔ بندوقیں اور کارتوس ان سے واپس لے لئے گئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ میر غلام علی تالپور کو مایوسی ہوئی ہے۔ لہذا انہیں اس گاؤں سے نکال دیا جائے گا۔ وہ مجھ سے قطعی ناواقف ہیں، اور وہ اپنی جانوں کے خوف سے اس شخص کے پاس گئے جو انسپکٹر سی آئی ڈی تھا، انہوں نے اس سے پہلے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن انہیں یہ معلوم تھا کہ یا تو وہ کراچی میں ہوگا یا حیدر آباد میں یا کہیں اور ہوگا۔ بہرحال انہوں نے اس کے پاس یہ رپورٹ درج کرائی کہ چونکہ میر غلام علی تالپور نے انہیں چیلنج دیا ہے اس لئے انکی زندگیاں سخت خطرے میں ہیں۔

مسٹر اسپیکر۔ مجھے امید ہے کہ معزز رکن غیر ضروری تفصیلات میں نہیں جائیں گے۔

میر غلام علی خان تالپور۔ جناب عالی! اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ غیر ضروری نہیں ہے۔

مسٹر ایچ۔ ایس سہروردی۔ کون شخص کس کو قتل کرنا چاہتا تھا؟ جناب عالی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم سب خطرے میں ہیں۔ ازراہ کرم اسے معمولی بات تصور نہ کیجئے۔

میر غلام علی خان تالپور۔ جناب عالی! لہذا ان لوگوں نے انسپکٹر سی آئی ڈی کے سامنے بیان دیا۔ اور میرے اور دوسرے سابق وزرائے اعلیٰ اور ممبران قانون ساز اسمبلی کے خلاف جھوٹا مقدمہ کھڑا کر دیا۔

جناب عالی! جیسا کہ شہادت میں کہا گیا ہے کہ اس واقعہ کی سب سے پہلے خبر دینے والا شخص ایک ڈپٹی کلکٹر تھا۔ جو اس وقت میرپور خاص میں تعینات تھا، وہاں سے وہ آیا اور اس نے حکومت کو اس سازش کے بارے میں اطلاع دی۔ حکومت کو سب سے پہلے اُسی نے اس سازش کی اطلاع دی۔ وہ مسٹر کھوڑو کے پاس آیا۔ انہیں بتایا اور پولیس کو بیان دیا کہ ایک خاص شخص میرپور خاص میں اس کے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ میر غلام علی خان مسٹر کھوڑو کو قتل کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ ابتدائی اطلاع تھی اور سرکاری رپورٹ تھی جو حکومت کو ڈپٹی کلکٹر نے فراہم کی تھی۔ سی آئی ڈی کو اس کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ میں نے جن الفاظ کا تذکرہ اس سے پہلے کیا ہے، یہ اس بیان ہی کے الفاظ ہیں۔ تحقیقات کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ جس شخص نے ابتدائی رپورٹ دی، وہ سی آئی ڈی کا اپنا آدمی ہے۔ اور دوسرے لوگ ان ارکان اسمبلی کے آدمی ہیں، جو مسٹر کھوڑو کے اپنے آدمی ہیں۔

ڈپٹی کلکٹر کی تبدیلی

جناب عالی! میں تفصیلات میں اس لئے جانا نہیں چاہتا کہ اس کے لئے بہت وقت درکار ہوگا۔ تفتیش کا کام دس دن یا دو ہفتوں میں مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔ لہذا ایک عبوری چالان ٹنڈو کے ڈویژنل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جب ڈویژنل مجسٹریٹ مسٹر سرہندی نے کبھی بھی مختیار یا تحصیلدار کی حیثیت سے کام نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ ہیڈ مختیار کار یا مجسٹریٹ کے عہدہ پر اس کا تقرر کبھی نہیں ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس سی آئی ڈی کو بھی ۱۹ مارچ کی شام کو چلتا کر دیا گیا۔ کیونکہ مذکورہ افسر یہ گھناؤنا کام کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ اور اسے علم تھا کہ معاملہ خاصہ سنگین ہے۔ اگر دفعہ ۳۰۲ کے تحت میرے خلاف جرم ثابت ہوگیا جو قتل عمد کا جرم ہے تو مجھے پھانسی دیجائے گی۔ جناب عالی اگر میں واقعی اس جرم کا مرتکب ہوں تو مجھے واقعی پھانسی ملنی چاہیئے۔ میں اپنی بریت کا خواہاں نہیں ہوں گا۔ اور نہ آنر ایبل وزیر اعظم سے کچھ کہوں گا۔ دوزخ میں میرا مستقل ٹھکانہ ہوگا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب جھوٹ اور افترا ہے۔ تو جناب یہ مقدمہ درج ہونے سے پہلے اس افسر کا تبادلہ کر دیا گیا۔

اب میں اس ڈپٹی کلکٹر کا تذکرہ کرتا ہوں۔ تبادلہ سے پہلے یہ ڈپٹی کلکٹر اسسٹنٹ کلکٹر تھا۔ افسر مذکور ایماندار اور راستباز تھا۔ وہ اتنا گرنا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اس نے اس گھناؤنی سازش میں ملوث ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ جناب عالی! اس انکار کے بعد وہ بھلا کیسے اپنے منصب پر رہ سکتا تھا چنانچہ اس کو کھسکا دیا گیا۔ مشکل سے ایک آدھ ہفتہ وہ اس منصب پر فائز رہا۔ اسے یہاں سے منتقل کر دیا گیا اور اس کی جگہ عظیم مسٹر سرہندی تشریف لائے۔ انہیں ۲۱ یا ۲۲ کو وہاں تعینات کیا گیا۔ مجھے صحیح تاریخ کا علم نہیں لیکن ایسی ہی کوئی تاریخ تھی۔ اور انہیں یہ گھناؤنا فریضہ سونپا گیا، جسے انہوں نے بڑی کامیابی سے سرانجام دیا۔ جناب عالی میرے علم اور یقین کے مطابق یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب آئندہ بجٹ اجلاس سے پہلے مسٹر کھوڑو حیدر آباد کے سرکٹ ہاؤس میں مقیم تھے۔ ان سب نے وہیں بیٹھ کر سازش کی۔ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس "مقدمہ سازش" میں معاونت کے لئے افسروں کے ایک ٹولے کا تقرر عمل میں آیا۔ کیونکہ یہ بہت اہم معاملہ تھا۔ اس لئے مسٹر سرہندی کی امداد و اعانت کے لئے ویسے ہی چند افسروں کی موجودگی ضروری تھی۔ صوبائی حکومت کے محکمہ مال کے ان افسروں کے علاوہ مسٹر وہراج کے ساتھ بعض پولیس عہدیداروں کو بھی لگایا گیا۔ مسٹر وہراج بہت مشہور آدمی ہیں۔ ان کا صرف ایک پاؤں ہے۔ شائد ان کا ایک پاؤں کاٹا جا چکا ہے۔

مسٹر اسپیکر۔ میں معزز رکن کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وہ نام نہ لیں۔

بددیانت اہلکاروں کو ترقی دیگئی

مسٹر غلام علی خان تالپور۔ مجھے افسوس ہے جناب عالی کہ بعض اوقات نام لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ورنہ سلسلہ اور رابطہ منقطع ہو جائے گا۔ اور اس لئے کہ ایوان کے معزز اراکین پوری طرح واقعات کو جان سکیں، مجھے بعض لوگوں کے نام لینے پڑتے ہیں۔ بہرحال میں حتی الامکان نام لینے سے احتراز کروں گا۔

جناب عالی! میں پہلے یہ بات کہہ چکا ہوں کہ اس ڈپٹی کلکٹر کے خلاف اینٹی کرپشن کے عہدیدار انکوائری کر رہے تھے۔ اور شائد اس وقت بھی انکوائری ہو رہی ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود انہیں ترقی دیکر ڈپٹی کلکٹر اور ایک اہم ڈویژن کا انچارج بنا دیا گیا۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ وہ کبھی مختیار کار یا تحصیلدار نہیں رہے، لیکن انہیں ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ترقی دے کر اوّل درجہ کا مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ اب میں اُس لنگڑے انسپکٹر کا تذکرہ کرتا ہوں۔

جناب عالی! معلوم ہے اس کی حیثیت عرفی کیا ہے؟ وہ سابقہ حکومت میں صرف ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ اسے ترقی دے کر سب انسپکٹر اور اس کے بعد انسپکٹر بنا دیا گیا۔

ایک ہندو کی متروکہ موٹر سائیکل کھوڑو کے گھر سے برآمد ہوئی

اور بالآخر اسے جبری طور پر ریٹائر ہونے یا رخصت پر جانے کے لئے کہا گیا۔ اس کے خلاف بدعنوانی کے سنگین الزامات ہیں، جن کی اینٹی کرپشن افسر تحقیقات کر رہا ہے۔ لیکن اسے ڈیوٹی پر واپس بلا لیا گیا جب کہ وہ محکمہ مال میں کام کر رہا تھا۔ اسے سینئر افسر کہا گیا اور اس مقدمے کا انچارج بنایا گیا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے خلاف بدعنوانیوں کی جو تحقیقات ہو رہی تھیں وہ بھی داخل دفتر ہو گئی ہوں گی۔ اسے اس کام کے لئے موزوں آدمی سمجھا گیا۔ اس سے پہلے اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا تھا۔ اور اسے محکمہ مال میں گیم وارڈن کی جگہ دی گئی تھی۔ تاکہ وہ پولیس کے محکمہ میں نہ رہے۔ اور بے گناہوں پر مظالم نہ ڈھائے، اس افسر کو یہاں لایا گیا اور اس مقدمہ کی تحقیقات کا ذمہ دار بنایا گیا۔ اس کے بعد مسٹر اے۔ آر عبدالرحمٰن کا ذکر آتا ہے، جنہوں نے اس سازش کی سب سے پہلے اطلاع دی تھی۔

جناب عالی! مجھے افسوس ہے کہ میں نے پھر اُن کا نام لیا۔ وہ ضلع تھرپارکر میں تھے۔ وہ وہاں سے آئے اور انہوں نے حکومت کو مطلع کیا کہ مسٹر کھوڑو قتل کئے جانے والے ہیں۔ اس افسر کو بھی اس گھناؤنے کام کے صلہ میں ترقی دے دی گئی۔ جناب عالی! آپ کو علم ہے کہ اس افسر کے خلاف بھی اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ میں انکوائری ہو رہی ہے مجھے امید ہے کہ ہز ایکسی لینسی گورنر سندھ بتائیں گے۔ کہ کس طرح تحقیقات کا معاملہ ان سے واپس لے کر داخل دفتر کر دیا گیا۔ میرے معاملے میں ان کی امداد کی وجہ سے انہیں نہ صرف ڈپٹی کلکٹر بنا دیا گیا، بلکہ ترقی دے کر کلکٹر بنا دیا گیا۔ وہ آج کل کلکٹر ہیں اور تحقیقات جو ان کے خلاف ہو رہی تھی، دبا دی گئی یا داخل دفتر کر دی گئی۔ مجھے علم نہیں کہ اس تحقیقات کا کیا حشر ہوا۔

ٹیلیفون پر فیصلہ

تفتیش کی منزل تک اس کہانی کا لب لباب میں نے پیش کر دیا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ میں نے چیف کورٹ میں اپنی اپیل، اس بنیاد پر کہ یہ سارا کیس من گھڑت اور بے بنیاد ہے، داخل کی ہے۔ میرے پاس دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ جو میں اس معزز ایوان کے سامنے پیش کرنے کو تیار ہوں۔ یہ دو بیانات ہیں جو پاکستان کے دو اعلیٰ ترین صاحبانِ اقتدار کے ہیں۔ ایک بیان آنرایبل سابق وزیر اعظم پاکستان کا ہے۔ اور دوسرا ہز ایکسی لینسی گورنر سندھ کا ہے، جنہوں نے صاف صاف اور غیر مبہم الفاظ میں کہا ہے کہ میر غلام علی تالپور ۱۲ اور ۱۳ کی رات کو ہمارے ساتھ تھے اور ہم سب ان کے ساتھ اسپیشل ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔

جناب عالی! اگر آپ پسند فرمائیں تو پڑھوں۔

مسٹر عطاء الرحمٰن۔ بڑی مہربانی ہو گی، ضرور پڑھیں۔

اسپیکر۔ ان کا پڑھنا آپ کے مقصد کے لئے ضروری نہیں ہے۔ معزز اراکین۔ یہ بہت اہم ہے۔

میر غلام علی تالپور۔ بہر حال میرا چالان کیا گیا۔ مجھ پہ مقدمہ قائم کیا گیا اور میں نے چیف کورٹ میں اپیل کی۔ سماعت کیلئے ۱۸ تاریخ مقرر ہو گئی۔ لیکن یہ بات میرے لئے اور ہر شخص کے لئے حیرت کا باعث تھی کہ اس مقدمہ کو ہمارے صوبے سے بالکل اچانک صوبۂ پنجاب میں منتقل کر دیا گیا۔

جناب عالی! یہ مقدمہ کس طرح ٹیلیفون پر منتقل ہوا، اپنے دوست ملک فیروز خان نون کے بارے میں یہ کہتے ہوئے مجھے افسوس ہے کہ ان کی جانب سے ایسے اہم مسائل کے بارے میں ٹیلیفون پر سمجھوتہ کیا جا رہا ہے اور ان کے بارے میں فیصلہ کیا جا رہا ہے اور انہیں منتقل کیا جا رہا ہے۔ کوئی چیز تحریر میں نہیں ہے۔ اس کی توثیق بعد میں ہوتی ہے۔ ٹیلیفون پر انہوں نے اس مسئلے کا فیصلہ کیا اور سندھ کا ایکسٹرا آرڈینری گزٹ جاری ہو گیا، جس میں اعلان کیا گیا کہ مقدمہ منتقل کر دیا گیا ہے۔ میرے پاس ملک فیروز خاں نون کا ایک دستاویزی ثبوت موجود ہے کہ انہیں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ دوسرے دن سندھ میں اس مقدمہ کی سماعت ہونے والی ہے۔ نیز یہ کہ اپیل عدالت میں زیر سماعت ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر یہ مقدمہ عدالت کے سامنے پیش ہوتا تو اس کا فیصلہ کیا ہوتا۔ یہ مقدمہ مسٹر کھوڑو کے گلے پڑ جاتا۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کل انہوں نے (مسٹر کھوڑو) اپنی تقریر کے دوران کہا تھا کہ ہم نے اس مقدمہ کو واپس لینے کا مطالبہ کیا تھا۔

جناب عالی! وزیر اعظم صاحب جو اس وقت وزیر خارجہ تھے، میرے بیان کی حمایت کریں گے کہ انہوں نے مجھے یاد کیا اور کہا کہ صوبے اور پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم اپنے اختلافات کا مظاہرہ سرِعام نہ کریں۔ انہوں نے کہا کہ یہ مقدمات ختم ہو جانے چاہئیں اور فوراً ختم ہو جانے چاہئیں۔ میں نے اس تجویز کی مخالفت نہیں کی۔ یہ وزیر اعظم کی خواہش تھی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آج بھی یہ مقدمہ چلا، تو مسٹر کھوڑو کے گلے پڑ جائے گا۔ مسٹر کھوڑو خود ہی اس کے ذمہ دار تھے۔

مسٹر کھوڑو نے اپنی تقریر کے دوران ہمارے محبوب قائدِ اعظم کا مقدس نام لیا ہے۔ اور اپنے آپ کو قائدِ اعظم کا رفیقِ کار بتایا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ مسٹر کھوڑو کو دو مرتبہ پروڈا کے تحت ہٹایا گیا۔ ایک مرتبہ انہیں قائدِ اعظم نے برخاست کیا اور چار سال کے لئے نا اہل قرار دیا گیا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۵۱-۵۰ء میں ہز ایکسی لینسی مسٹر غلام محمد نے انہیں پروڈا کے تحت تین سال کے لئے نا اہل قرار دیا۔ سندھ کی سیاسیات میں پروڈا کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ لیکن جناب عالی! مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہو رہا ہے کہ آج کی تاریخ تک میں اور صرف میں واحد شخص ہوں، جسے پروڈا سے باعزت طور پر بری کیا گیا اور نہ صرف سندھ کی چیف کورٹ کے چیف جسٹس نے میرے حق میں فیصلہ دیا، بلکہ ہز ایکسی لینسی گورنر جنرل مسٹر غلام محمد نے بھی اسے طے کر دیا۔

یہ ہلاکو اور چنگیز کی حکومت ہے

جناب عالی! آج کل سیاست دان کا مقصد کیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ سیاستداں استعفیٰ نہیں دیتے یا باوقار طریقہ پر حکومت سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ بلکہ انہیں ہمیشہ بدعنوانیوں، بدانتظامیوں، اقربا پروری خویش پروری اور بددیانتی کی بناء پر علیحدہ کیا جاتا ہے۔

جناب عالی! میں واحد شخص ہوں جس کی مثال دی جا سکتی ہے کہ میں مرکزی وزارت سے مستعفی ہو کر صوبائی سیاست میں داخل ہوا ہوں۔ یہاں میں یہ بتا دوں کہ مرکزی حکومت سے میرا کوئی اختلاف نہیں۔ میں سندھ کی سیاسیات میں حصہ لینا اور اپنے صوبے کے مظلوم عوام کو بچانا چاہتا تھا۔ جنہیں مسٹر کھوڑو کی حکومت میں سخت پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انہیں جیل بھیجا جا رہا ہے۔ غنڈہ ایکٹ اور پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت ان پر مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں یہ عرض کروں کہ یہ ہلاکو اور چنگیز خان کی حکومت ہے بلکہ ان حکومتوں سے بھی بدتر ہے۔ اس وجہ سے میں نے مرکزی کابینہ سے استعفیٰ دے دیا اور سندھ کی سیاست میں شریک ہوا میں اسمبلی کا اسپیکر ہونا چاہتا تھا اور اپنے صوبے کو بچانا چاہتا تھا۔

چوری میں سزا، قتل میں ماخوذ

جناب عالی! مجھے اس لائنو ٹائپ مشین کے بارے

اس نظام میں بڑے لوگوں کو سزائیں نہیں دی جاتیں

میں کچھ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں جو حکومت کی ملکیت تھی لیکن مسٹر کھوڑو کے قبضہ سے برآمد ہوئی۔ انہیں دو سال کی سزا دی گئی۔ عدالتِ خفیفہ میں ان کا چالان زیرِ دفعہ ۴۰۹ ہوا تھا۔ لیکن چیف کورٹ میں ایڈووکیٹ جنرل نے ترمیم کرا کے دفعہ ۴۰۹ کے بجائے دفعہ ۴۲۰ کے تحت مقدمہ قائم کرایا۔ جس کی وجہ سے سزا ختم کر دی گئی۔ میں ان بہت سے مقدمات میں جانا نہیں چاہتا جن میں قتل کا وہ الزام بھی شامل ہے، جس کے تحت وہ حوالاتی کی حیثیت سے ایک سال تک جیل میں رہے۔ پاکستان کے دونوں صوبوں کے معزز اراکین مسٹر کھوڑو سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ایک اور فوجداری کا مقدمہ قائم ہوا تھا۔ اس مقدمے کا قصہ یہ ہے۔ کہ ایک موٹر سائیکل جو کسی تارکِ وطن ہندو کی ملکیت تھی مسٹر کھوڑو کے قبضے سے برآمد ہوئی۔ یہ موٹر سائیکل انکے گھر سے نکلی تھی۔ لیکن بڑے لوگوں کے خلاف مقدمات کامیاب نہیں ہوتے اور وہ پھر چھوٹ گئے۔

قاضی فضل اللہ کے خلاف بم کیس

مسٹر کھوڑو نے قاضی فضل اللہ کا حوالہ دیا ہے مؤخر الذکر وہ صاحب ہیں جنہوں نے مسٹر کھوڑو کا سیاسی کیریر بنایا ہے۔ مسٹر کھوڑو نے قاضی فضل اللہ کا سیاسی کیریر نہیں بنایا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۵۳ء میں صوبے میں دفعہ ۹۲ الف کا نفاذ تھا۔ عام انتخابات ہوئے۔ مسٹر کھوڑو پر پروڈا کی پابندی عائد تھی لیکن ان کی پارٹی کے دوسرے لوگ تو موجود تھے انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوئے۔ ۵۳ء کے انتخابات کے بارے میں کسی شخص نے نکتہ چینی نہیں کی۔ یہ انتخابات صوبے میں دفعہ ۹۲ الف کے نفاذ کے کوئی ڈیڑھ سال بعد عمل میں آئے تھے۔ اس وقت کوئی شخص برسرِ اقتدار نہیں تھا۔ ہم سب نے مساوی سطح پر انتخابات لڑے۔ مسٹر کھوڑو نے ان انتخابات میں صرف ۴ نشستیں حاصل کی تھیں۔ ہم سب نے مشترکہ طور پر ایوان میں جو موجودہ ایوان ہے، ۷۰ یا ۸۰ کی اکثریت حاصل کی تھی۔ انہوں نے مجھے اسپیکر شپ سے علیحدہ کر دیا۔ یہ عجیب اور اندوہناک داستان ہے۔

ڈپٹی اسپیکر نے ۱۲ مارچ کو جب وہ ایوان کی صدارت کر رہے تھے، اچانک اپنی جیب سے ایک تحریکِ عدمِ اعتماد نکالی۔ عدمِ اعتماد کی تحریک پیش کرنے کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے مطابق ۱۴ دن کا نوٹس دیا جانا چاہیئے تھا۔ چنانچہ وہ تحریک جعلی تھی۔ میں ۱۲ مارچ تک اسپیکر تھا تحریک عدمِ اعتماد مجھے یا اسمبلی کے سیکرٹری یا ڈپٹی سیکرٹری کو براہِ راست دی جانی چاہیئے تھی۔ ڈپٹی اسپیکر اس تحریک کا مسودہ وصول کرنے کا مجاز نہ تھا۔ بہرحال میرے خلاف عدمِ اعتماد کی تحریک پاس کر دی گئی۔ کیا کوئی شخص اس کا تصور کر سکتا ہے؟ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ اپنے صوبے میں حتیٰ کہ صوبے کے باہر بھی میرا کتنا احترام کیا جاتا ہے۔

جنابِ عالی! تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ قاضی فضل اللہ نے مسٹر کھوڑو کا کیریر بنایا ہے۔ اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟ قاضی فضل اللہ کے خلاف بم کا سنگین کیس رجسٹر کیا گیا۔ میں اس مقدمے کی صحت و عدمِ صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن اتنا کہنا کافی ہے کہ فضل اللہ کو اسمبلی ہال کے دروازے پر گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے خلاف بم کا مقدمہ چل رہا ہے۔ انہیں قانون ساز اسمبلی کے انتخاب کے دن عین اس وقت ہٹا دیا گیا، جب وہ اسمبلی ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ دوسرے دن وہ عدالت میں پیش ہوئے۔ لیکن چونکہ مقصد پورا ہو چکا تھا اس لئے ان کی ضمانت منظور ہو گئی۔

جنابِ عالی! بم کیس ناقابلِ ضمانت جرم ہے، لیکن اتنی آسانی سے ضمانت منظور کر لینے کی کیا وجہ تھی؟ انہیں جیل میں سڑانے کے بجائے رہا کر دیا گیا۔ جنابِ عالی جو کچھ میں نے سنا ہے وہ یہ ہے کہ درحقیقت پولیس سابق وزیر کے گھر کی تلاشی کے دوران ایک بم رکھنا چاہتی تھی۔ یہ بات ان کی گرفتاری سے دو تین دن پہلے کی ہے۔ مسٹر کھوڑو واقعی چاہتے تھے کہ تلاشی لی جائے اور بم ان کے گھر سے برآمد کیا جائے۔ لیکن پولیس اس حد تک نہیں جا سکی، مسٹر کھوڑو کا مقصد دوسرے طریقے سے پورا ہو گیا اور راہ کی رکاوٹ دور ہو گئی۔ وہ صرف انکا استیصال اور انہیں اپنی راہ سے ہٹانا چاہتے تھے۔ دوسرے دن انہیں عدالت میں پیش کیا گیا۔ اور ان کی ضمانت منظور ہو گئی۔ یہ ہے حقیقت شہرۂ آفاق بم کیس کی۔

روپیہ کے معاملہ میں غیر معتبر آدمی

جنابِ عالی! آپ کو معلوم ہے کہ جب مسٹر کھوڑو ایک معمولی آدمی تھے تو ان کی حیثیت اور مقام کیا تھا۔ میں مسٹر کھوڑو کی حیثیت پر حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن میں ان کی اصل حیثیت بتانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ مقدمات سچے ہیں۔ اور انہیں پولیس کی تفتیش کا کوئی علم نہیں تھا۔ اور نہ انہیں ان مقدمات کا علم تھا۔ انہوں نے گزشتہ باتوں کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ واقعات کیسے رونما ہوئے کس طرح سازش تیار کی گئی۔ اور لوگوں کو کس طرح اسمبلی سے ہٹایا گیا۔ مسٹر کھوڑو اب کہتے ہیں کہ انہوں نے تمام اچھی باتیں کی ہیں۔ کوئی بدعنوانی اور بدانتظامی نہیں ہوئی۔ ان کا کردار بے داغ ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان پر کوئی آدمی بھروسہ نہیں کرتا تھا، جیسا کہ میں آگے عرض کروں گا۔

جنابِ عالی! سنٹرل ریلیف فنڈ کی انچارج مادرِ ملت ہیں۔ انہوں نے صوبہ سرحد میں وہاں کے وزیرِ اعلیٰ کو اور پنجاب اور مشرقی پاکستان میں بھی ان صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو اس مد میں خرچ کی جانے والی رقم دی۔ لیکن صوبہ سندھ میں کیا ہوا؟ یہاں یہ رقم وزیرِ اعلیٰ کو جو مسٹر کھوڑو ہیں، نہیں دی۔ بلکہ یہ رقم گورنر سندھ نواب ممدوٹ کو دی۔

جنابِ عالی! یہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ مجھے مزید وقت ملنا چاہیئے کیونکہ میں ابھی تک ان تمام نکات سے بحث نہیں کر سکا ہوں، جو انہوں نے اپنی تقریر کے دوران پیش کئے تھے۔

مسٹر اسپیکر۔ میرا خیال ہے کہ آپ مکمل کر چکے۔

ملک فیروز محمد خاں نون (پنجاب)۔ نہیں جناب انہوں نے ابھی مکمل نہیں کئے۔

میر غلام علی تالپور۔ اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ میں اپنی تقریر ختم کر دوں تو میں ختم کئے دیتا ہوں۔ البتہ میں ایک نقطہ کہنا چاہتا ہوں۔ میری وزیرِ اعظم سے دست بستہ گزارش ہے۔ جنابِ عالی! مسٹر سہروردی نے اپنی تقریر کے دوران مطالبہ کیا ہے کہ مسٹر کھوڑو کے خلاف عدالتی اور پبلک انکوائری ہونی چاہیئے۔

مسٹر ظہیر الدین (مشرقی پاکستان)۔ ہم سب کا یہی مطالبہ ہے۔

جنابِ عالی! آپ کو علم ہے کہ میں مسلم لیگ پارٹی سے متعلق ہوں۔ میں مسلم لیگ کا ایک حقیر کارکن ہوں۔ میں نے ۱۹۲۸ء میں مسٹر کھوڑو کے ساتھ مسلم لیگ میں شرکت کی تھی، لیکن مسٹر کھوڑو نے مسلم لیگ کو چھوڑ دیا، اور بارہا مسلم لیگ کے خلاف انتخابات لڑے۔

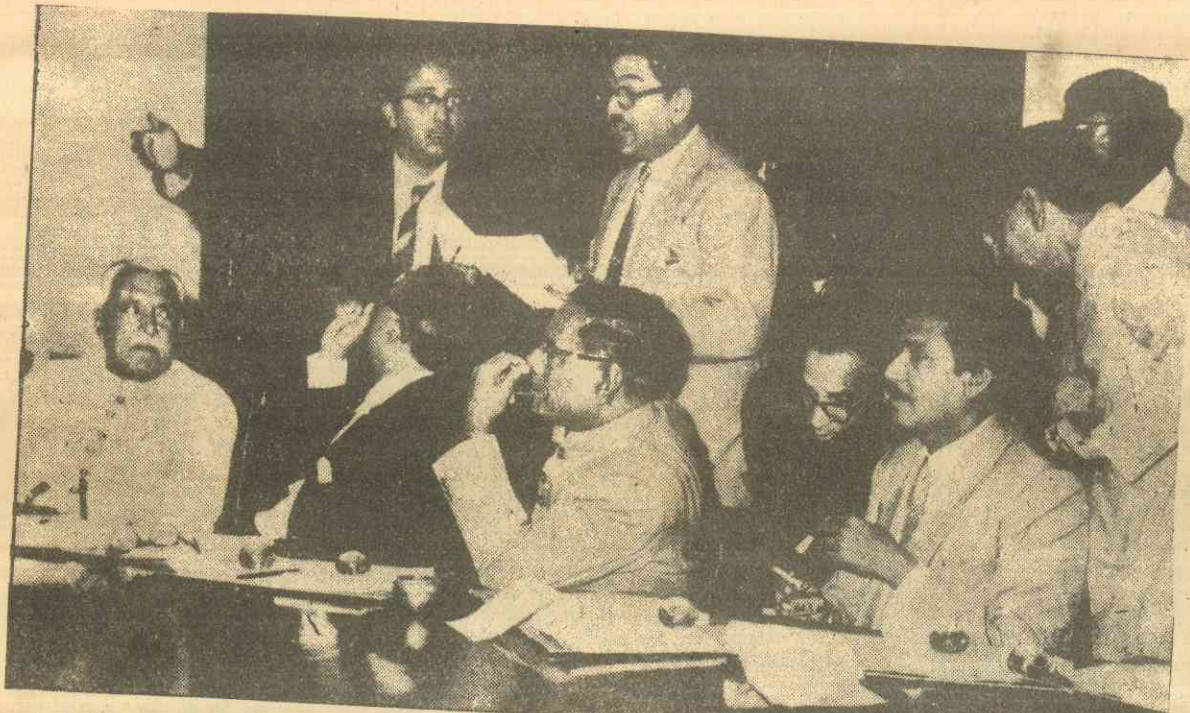
جنابِ عالی! ۱۹۵۴ء میں جب ہم مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخابات لڑ رہے تھے، جو پارلیمانی بورڈ نے دیئے تھے، تو

مسٹر کھوڑو نے اپنی لیگ، سندھ لیگ قائم کی اور انہوں نے مخالف ٹکٹ پر انتخاب لڑا۔ حتیٰ کہ مسٹر کھوڑو کی لیگ کے بیلٹ بکسوں کا رنگ بھی سیاہ و سفید تھا، جبکہ سرکاری طور پر مسلم لیگ کے بیلٹ بکس کا رنگ ہرا تھا۔ جو سارے پاکستان میں مسلم لیگ کا رنگ ہے۔

وزیر اعظم، خدا کے لئے

مسٹر اسپیکر! میں نہایت عجز کے ساتھ آنرایبل وزیرِ اعظم سے اللہ کے نام پر، خدائے قادرِ مطلق کے نام پر، اور ان تمام چیزوں کے نام پر جو ہمارے محبوب وزیرِ اعظم کو عزیز اور پیاری ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ ان واقعات کی پبلک انکوائری۔ عدالتی انکوائری کی جائے تاکہ ملک کو ان تمام باتوں کے بارے میں علم ہو۔ اور عوام کو معلوم ہو کہ سچائی کیا ہے۔ اگر آپ مسٹر کھوڑو کے خلاف انکوائری کرانا نہیں

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں



۱۹۵۶ء کی ایک یادگار تصویر: میاں افتخار الدین مرحوم، شیخ مجیب الرحمٰن کی کوئی بات کان لگا کر سن رہے ہیں

مُسلم لیگ نے قوم کو آئین سے محروم رکھنے کی سازش کی تھی

قومی اسمبلی میں میاں افتخار الدین کی تقریر

میاں افتخار الدین پاکستان نیشنل اسمبلی کے سب سے بااصول اور بیباک رُکن تھے۔ انہیں مسلم لیگ پارٹی سے خارج کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ زہرِ ہلاہل کو کبھی قند نہ کہہ سکے۔ ان کے اخباروں کے خلاف کبھی ناکام اور کبھی کامیاب سازشیں کی گئیں۔ ان پر جھوٹے مقدمے چلائے گئے۔ ان کی جائیداد ضبط کی گئی۔ حتیٰ کہ ڈھاکہ میں ان پر حملہ بھی ہُوا مگر میاں صاحب نے حق گوئی اور صداقت سے کبھی اِنحراف نہیں کیا۔ ذیل میں ہم ان کی ایک معرکتہ الارا تقریر کے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو مرحوم نے ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو چوہدری محمد علی کے نام نہاد جمہوری آئین کی منظوری کے موقع پر قومی اسمبلی میں کی تھی۔ میاں صاحب نے اس آئین اور ملکی سیاست کے بارے میں جن خطرات کا اظہار اب سے سولہ برس پیشتر کیا تھا وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہو رہے ہیں۔ (ادارہ)

جنابِ اسپیکر!

اللہ اللہ کرکے آٹھ سال کے بعد آج دستورِ اساسی منظور ہونے والا ہے۔ تاریخ کے ساتھ زیادتی ہوگی اگر قوم کو یہ نہ بتایا جائے کہ اس کام میں اتنی دیرکیوں کی گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ میں مسلم لیگ کا رُکن تھا اور ان چند مسلمان ممبروں میں سے ایک تھا جو وقتاً فوقتاً آزادی سے اپنے خیالات ظاہر کرنے کی جرأت کرتے تھے۔ چنانچہ میں نے دسمبر ۱۹۴۹ء اور جنوری ۱۹۵۰ء میں قائدِ ایوان جناب لیاقت علی خان سے عرض کیا تھا کہ اسمبلی کو فوراً توڑ دیا جائے۔ اور بالغ رائے دہی کے اصول پر پھر سے انتخابات ہوں تاکہ براہِ راست منتخبہ اسمبلی دستور سازی کا کام انجام دے۔

جنابِ والا! شاید آپ کو یہ بھی یاد ہو کہ چند دوسری اور خاص کر اس تقریر کی پاداش میں مجھے مسلم لیگ پارٹی سے خارج کر دیا گیا۔

جناب والا! اس کے بعد بھی میں نے اپنی رائے تبدیل نہیں کی اور سابقہ اسمبلی کے سامنے اساسی اصولوں (یہ دوسری اساسی اصول کمیٹی تھی) کی کمیٹی کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا تھا اور میں نے اس میں اپنا اختلافی نوٹ شامل کرایا تھا۔ میں نے پھر یہی تجویز کی تھی کہ اس ایوان کو توڑ دیا جائے اور فوری طور سے انتخابات کرائے جائیں۔ سرکاری پارٹی والوں نے پچھلے دو ماہ کے دوران میں اس اسمبلی اور مجوزہ دستور کی حمایت میں لچھے دار تقریریں کی ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو کہتے تھے کہ سابقہ اسمبلی سے دستور سازی کا حق نہیں

وفاق کے نام پر وحدانی طرزِ حکومت بنا کر بنگال کو دھوکہ دیا گیا

چھینا جا سکتا۔ جب میں سابقہ اسمبلی کے قائدِ ایوان خواجہ ناظم الدین پر نکتہ چینی کرتا تھا اور ان کے دستوری نظریات اور قوتِ فیصلہ کی کمی پر حرف گیری کرتا تھا تو انہی دوستوں نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا تھا مگر انہی برادرانِ یوسف نے خواجہ ناظم الدین پر اپنے مکمل اعتماد کا اظہار کیا اور ۱۳ر اپریل کو بجٹ منظور کیا اور تین ہی دن بعد ان کو نکال باہر کیا (۱۳ر اپریل کو خواجہ صاحب کی حکومت کا بجٹ منظور کیا گیا اور ۱۶ر اپریل کو انہیں معزول کر دیا گیا)

جنابِ والا! تیسری بار جب محمد علی بوگرا نے اس ایوان کے سامنے دستور کا مسودہ پیش کیا تو میں وہ تنہا شخص تھا۔ جس نے کہا تھا کہ ایک متفقہ نہیں تو کم از کم جمہوری دستور جلد از جلد یونہی بن سکتا ہے کہ اسمبلی کو توڑ دیا جائے۔ اور فوری انتخابات ہو جائیں۔ میں نے یہ تجویز اس بات کے پیشِ نظر بھی کی تھی کہ حکومت کا کہنا تھا کہ وہ چھ ماہ یا سال بھر کے اندر اندر انتخابات کرائے گی۔ مفاد پرستوں کے اس ٹولے نے پہلے تو دستور اساسی بنانے میں دیر کی۔ پھر اسی نے اسمبلی توڑنے کی مخالفت کی۔ اسی نے جوڑ توڑ کر کے خواجہ ناظم الدین کو وزیرِ اعظم بنایا اور ان کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسمبلی اور دستور اب ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے اور خود محمد علی بوگرا اور ان کے ساتھیوں سے وہ پورا فائدہ اٹھا چکے ہیں تو اسی ٹولے نے انتہائی غیر جمہوری انداز میں اسمبلی کو توڑ دیا اور موجودہ اسمبلی کی مخالفت کرتے رہے۔ موجودہ وزیرِ قانون نے جو دستورِ اساسی کے محرک ہیں اور اس کو منظور کروانے کی غرض سے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، آٹھ ماہ تک یہی کوشش کی کہ یہ اسمبلی وجود میں نہ آ سکے۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہی لوگ آٹھ ماہ تک ٹس سے مس ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ وہ تو بھلا ہوا عدلیہ کا کہ اس نے اس اسمبلی کو قائم کرنے پر ان کو مجبور کر دیا اور آٹھ نو ماہ گزرنے کے بعد موجودہ دستور سامنے آیا۔ میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ اس تاخیر کا سبب حزبِ مخالف نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ تو برسرِ اقتدار پارٹی میں آپس میں جوتم پیزار ہے۔ پچھلے ستمبر کے اواخر سے اس سال ۹ر ۱۰ر جنوری تک وزیرِ اعظم اپنے پارٹی ممبروں کو رام کرنے، سمجھانے بجھانے اور ڈرانے دھمکانے میں لگے رہے تب کہیں جا کر دستور پر کوئی راضی نامہ ہو سکا۔

جنابِ والا! ملک و قوم کے ساتھ غداری ہو گی۔ اگر اس کو یہ نہ بتایا جائے کہ یہ مسلم لیگی گروہ تھا جس نے دستورِ اساسی بنانے میں دیر کی اور میں یہی ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ مسلم لیگ ہی تھی جس نے وہ تمام گھناؤنی حرکتیں کیں جن پر میں روشنی ڈال چکا ہوں اور جن کی وجہ سے ہمارے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ چکا ہے اور ان سب کے لیے مسلم لیگ مجرم ہے نہ کہ حزبِ اختلاف!

جنابِ والا! آج جب کہ آٹھ سال کے بعد دستور منظوری کے لیے پیش کیا گیا ہے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میری قوم خود یہ فیصلہ کرے کہ وزیرِ اعظم چوہدری محمد علی اور ان کے رفقائے کار نے اس ملک کے جمہوری اداروں اور روایتوں کو جو تباہ کیا ہے، کیا اس کی ضرورت تھی۔ آج جس قسم کا دستورِ اساسی ہمیں دیا جا رہا ہے کیا اسی کے لیے یہ پاپڑ بیلنے ضروری تھے۔ میں وزیرِ اعظم چوہدری محمد علی سے پوچھتا ہوں جو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ذمہ دار ہیں۔ کیا خواجہ ناظم الدین کو جس طرح نکالا گیا ہے وہ مناسب تھا۔ کیا اسمبلی کو توڑنا صحیح تھا؟

جنابِ والا! میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ نہ اس قدر دیر لگانے اور غیر جمہوری حرکتیں کرنے کی چنداں ضرورت تھی اور نہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کی۔ یہ موجودہ دستور خواجہ ناظم الدین کے مجوزہ دستور سے بہت ملتا جلتا ہے بس ایک ہی فرق ہے کہ حقِ ملکیت کے ضمن میں زمیندار طبقہ کی جس سے میرا بھی تعلق ہے، پشت پناہی کی گئی ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ تحفظ عطا کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ دستور خواجہ ناظم الدین کے مجوزہ دستور سے کسی طرح بہتر نہیں۔

جنابِ والا!

اگر اس دستور کو مفید مطلب بنایا گیا ہوتا تب بھی میں ملک کو ضرور یاد دلاتا کہ ہماری کوشش یہ تھی کہ دستور کا مسئلہ انتخابی نزاع کا سبب نہ بنے۔ اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا جب کہ ایک سال پہلے تک وزیرِ اعظم کی رائے تھی کہ ایک مطلق العنان حکومت ملک کے سر ایک دستور تھوپ دے نہ اس کا یہ مطلب تھا کہ ایک ایسی اسمبلی جو نمائندہ ہونے کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں رکھتی دستور بنائے۔ ہمارے ایسے لوگ تو یہ چاہتے تھے کہ ملک میں براہِ راست انتخابات کرائے جائیں اور پھر دستور بنایا جائے کیونکہ ہمارا پختہ یقین ہے کہ اس طرح اتفاقِ رائے سے دستور بن سکے گا۔ جس سے کسی کو بھی شکایت نہیں ہو گی اس لیے ہم یہ زور دیتے تھے کہ دستور کو انتخابی نزاع کا سبب نہ بننے دیا جائے (یہ وضاحت اس لیے بھی ضروری تھی) مجھے اندیشہ ہے کہ اس دستور سے ضرور کشیدگی پھیلے گی۔

جنابِ والا!

کہنے والے ضرور کہیں گے کہ جو کچھ کیا گیا ہے اس سے مفر ہی نہیں تھی۔ وہ ضرور یہی دلیل لائیں گے کہ گورنر جنرل (غلام محمد مرحوم) کے آمرانہ اقدام اس لیے ضروری تھے کہ ان کے بغیر اس وقت کا برسرِ اقتدار بنگالی ٹولہ جس کی اکثریت تھی بات نہ مانتا۔ اس سلسلے میں میں مسلم لیگی رہنماؤں سے کہوں گا کہ ذرا یاد کرو تم کیا پراپیگنڈا کرتے ہو۔ اگر ہم سب مسلمان ہیں۔ اگر ہم ایک قوم ہیں تو مضائقہ نہیں کہ اس ایوان میں بنگالی ممبروں کی تعداد زیادہ ہو اور مغربی پاکستانیوں کی کم؟

جہاں تک میرا تعلق ہے میرے خیالات سب کو معلوم ہیں اور پچھلے سات برس میں میں ان کا برابر اظہار کرتا رہا ہوں۔ میری خوش نصیبی ہے کہ اسی ایوان میں میں بارہا اس موضوع پر روشنی ڈال چکا ہوں۔ میں تو اس خیال کا حامی ہوں کہ مغربی پاکستان میں لسانی بنیاد پر ایک وفاقی یا ذیلی وفاق قائم کیا جائے اور مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا ایک کنفیڈریشن بنے جس کے پاس محدود اختیارات ہوں اور دونوں صوبوں کو مساوی حیثیت حاصل ہو، کیونکہ میرے نزدیک اتحاد و یگانگت کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ تمام اختیارات مرکز کے حوالے کرنے سے اتحاد و یگانگت کے نشو و نما اور فروغ کا مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ میں چوہدری محمد علی اور ان کے رفقائے کار سے پوچھتا ہوں کہ وہ کونسی مصلحت تھی جس کی بنا پر انہوں نے بنگال کو اس ایوان میں اکثریت دینے پر رضامندی ظاہر نہیں کی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس سوال کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے گا اور اس کو معنی پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ حالانکہ میرا نقطۂ نظر کسی سے پوشیدہ نہیں کیونکہ کنفیڈریشن میں شامل وحدتوں کو مساوی نمائندگی دی جاتی ہے۔

تو جناب! میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ان لوگوں نے کیا ہے وہ ہرگز اس کے مجاز نہیں تھے۔ میں جانتا ہوں کہ اب بھی لوگ اس بیان کو لوگوں کے جذبات ابھارنے اور علاقائی عصبیت کو ہوا دینے کی غرض سے استعمال کریں گے۔ جناب میں محسوس کرتا ہوں کہ پاکستان کے ایک حصے کے ساتھ دھوکہ

مسلم لیگ نے غلام محمدؒ کے آمرانہ اقدامات کی حمایت کی

کیا گیا ہے۔ مساوات کا اصول اس شرط کے ساتھ طے پایا تھا کہ مرکز کے پاس محدود اختیارات ہوں گے۔ اور اس وقت بیچ بازار ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا کہ بہت وسیع پیمانے پر تقسیم اختیارات کی جائے گی۔ اگر میرا حافظہ ٹھیک ہے تو عوامی مسلم لیگ ہی بنگال کی پہلی پارٹی تھی جس نے مساوات کا اصول طے کیا تھا اور جس نے اعلان کیا تھا کہ مرکز کے پاس صرف تین محکمے ہوں گے لیکن آج کچھ اور ہی نظر آ رہا ہے اور مرکز کو زیادہ سے زیادہ طاقتور بنایا گیا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بنگال کو چوٹ دی گئی ہے اور وفاق کے نام پر وحدانی طرز حکومت اختیار کیا گیا ہے۔ جہاں تک مقامی منتخب اداروں کا تعلق ہے تو کون نہیں جانتا کہ اس ملک میں میونسپلٹیاں ڈسٹرکٹ بورڈ پہلے ہی سے قائم ہیں لیکن یہ ادارے خود مختار نہیں ہیں بنگال سے جس قسم کی خود مختاری کا وعدہ کیا گیا تھا اور جس کی بنیاد پر مساوات کا اصول منوایا گیا تھا اس قسم کی خود مختاری نہیں دی جا رہی ہے۔ میں اس مسئلہ پر یونہی دماغ پاشی نہیں کر رہا ہوں اور نہ خواہ مخواہ بنگال یا مغربی پاکستان کے لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر رہا ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگلے چھ یا آٹھ ماہ بعد جب انتخابات کا زمانہ قریب آئے گا بلکہ انتخابات ہوئے تو یہی سوال ہمارے خلاف اٹھایا جائے گا اور دونوں صوبوں میں شدید اختلافات اور نفاق انگیز جذبات پیدا ہوں گے۔

جناب والا!

مجھ سے پہلے جو صاحب تقریر کر رہے تھے انہوں نے وزیر اعظم صاحب کی خوش تدبیری کی بہت تعریف کی کہ انہوں نے ایک ایسا اصول گھڑا کہ بنگال میں انتخابات کا طریقہ کچھ ہوگا اور مغربی پاکستان میں کچھ اور۔ یہی وہ بات ہے جو میں اور میرے ہم خیال لوگ نہیں چاہتے۔ ہم پاکستان میں دو مختلف نظریوں کو جنم دینے کے خلاف ہیں۔ آپ جب دستوری معاملات پر غور کر رہے ہیں تو آپ کو یہ بھی فیصلہ کرنا ہوگا کہ ملک میں جداگانہ انتخابات کا طریقہ رائج کیا جائے یا مشترک انتخاب کا۔ یہ سوال چند اہم سوالوں میں سے ایک ہے اور اس سے دونوں صوبوں کے عوام، علماء اور دوسرے حلقوں نے بہت دلچسپی ظاہر کی ہے۔ اس سب سے اہم مسئلہ کے بارے میں آپ دو مختلف طریقے اختیار کر رہے ہیں۔

اس کا مطلب ملک میں دو متضاد نظریات کی ترویج ہوگا اور دستور میں اس کو شامل کرنے کا مطلب ملک میں انتشار پھیلانے کے مترادف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ جن دو نظریات پر ہم یہ دستور بنا رہے ہیں۔ وہ ملک میں نفاق کو زیادہ ہوا دے گا (اس مرحلہ پر اسپیکر نے میاں صاحب کو ہدایت کی کہ وہ اپنی تقریر مختصر کریں۔ چنانچہ انہوں نے علماء کمیشن کی تجویز پر اپنے خیالات کا اظہار شروع کیا)

جناب والا!

میں بہت ہی اختصار سے کام لوں گا۔ جناب علما کمیشن کی تجویز ظاہر کرتی ہے کہ اس ایوان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں اور وہ اپنے کو کسی اور کا دست نگر بنا رہا ہے۔ جناب والا! اگر اس کمیشن میں آپ کے ایسے ایماندار علماء شامل ہوں تو میں اسے قبول کر لوں گا۔ اس لیے کہ دستور یا موجودہ قانون ساز اسمبلی کو اس سے کوئی اندیشہ لاحق نہ ہوگا۔ لیکن جناب یہ نہیں ہوگا۔ جن لوگوں کو اس کمیشن میں نامزد کیا جائے گا۔ وہ حکومتِ وقت کے آلۂ کار اور حاشیہ بردار ہوں گے اور حکمرانوں کی مرضی کے مطابق قوانین کی تفسیر کریں گے۔

دیکھئے نا! میرے صوبے کے گورنر کی قیادت میں ایک وفد وزیر اعظم سے ملا تھا۔ اس وفد میں زمیندار اور سابق لیفٹیننٹ اور میرے ایک دوست جو زمیندار بھی ہیں اور ہندو بھی شامل تھے کیونکہ ان سب کا مفاد ایک تھا۔ زمیندار ہونے کے ناطے سے وہ سب ایک ہیں۔ اس وفد نے وزیر اعظم سے بات کی اور ان پر اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ تو جناب وزیر اعظم صاحب نے، جنہوں نے اس دستور کی اسلامی حیثیت اور اسلامی اصول کی تعریف میں ایسی زبردست اور فصیح و بلیغ تقریر داغی، ان زمینداروں کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور دستور میں ایسی دفعہ شامل کی جس کی رو سے اس اسلامی مملکتِ پاکستان میں حقوقِ ملکیت کا پہلے سے زیادہ تحفظ کیا گیا ہے۔ جناب گورمانی صاحب کی جرأت کی داد دیتا ہوں کہ انہوں نے فرمایا کہ یہ سرمایہ داری کا دور ہے۔ قائداعظم نے تو ملک میں اسلامی سوشلزم کے نفاذ کا اعلان کیا تھا مگر گورمانی صاحب نے سرمایہ داری کا نعرہ مارا اور وزیر اعظم صاحب نے بھیگی بلی کی مانند ان کی بات مان لی اور مالدار طبقوں کو قانونی تحفظ عطا کیا۔

ایسا تحفظ جو جمہوریہ ہند نے بھی نہیں دیا بلکہ اس نے قانونی ملکیت میں ترمیم کی اور اس کو سوشلزم سے قریب تر لانے کی کوشش کی مگر ہم اپنے وعدہ سے پھر گئے اور ہم نے اپنے ملک کو مملکتِ سرمایہ داری بنا کر چھوڑا۔

جناب والا!

اس سلسلے میں قوم کو ایک اور معمولی سا واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں جس نے قیامِ پاکستان میں مدد کی تھی وہ یہ ہے کہ جناب لیاقت علی جب حکومتِ ہند کے وزیر خزانہ تھے تو انہوں نے ۱۹۴۶-۴۷ء کا جو بجٹ پیش کیا تھا اس کی تیاری میں ہمارے موجودہ وزیر اعظم نے ان کا ہاتھ بٹایا تھا اور بجٹ کو بہت حد تک سوشلسٹ انداز پر تیار کیا گیا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ ہندوستان کے ہندو سرمایہ دار اور مالدار طبقے چیخ اٹھے تھے اور انہوں نے اس کی مخالفت کی تھی۔ سیٹھ برلا جیسے لوگ پاکستان کے سخت مخالف تھے مگر انہوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کو پاکستان دو اور جان چھڑاؤ۔ جناب جب ہم پاکستان کے لیے لڑ رہے تھے تو ہم نے لوگوں کو یہی باور کرایا تھا کہ جمہور کے ساتھ انصاف ہوگا۔ اور زمینداروں اور سرمایہ داروں کو لوٹ کھسوٹ کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ موجودہ وزیر اعظم کو یہ بات معلوم ہے کہ پھر بھی انہوں نے خاموشی سے زمینداروں اور سرمایہ داروں کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اور ان کو زیادہ سے زیادہ تحفظات عطا کر دیئے۔

جناب والا!

مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ وزیر اعظم نیک آدمی ہیں، وہ غریب کر ہی کیا سکتے ہیں۔ ان کی پارٹی میں تو زمیندار بھرے ہوئے ہیں جن کا نام لینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ وہ اتنا دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وزیر اعظم بے دست و پا ہو کر رہ گئے ہیں۔ جناب مجھے یہ سب بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ کی اجازت سے میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ وزیر اعظم اگر کچھ کرنا چاہیں تو پھر ان کو کوئی روک نہیں سکتا۔

جناب والا!

میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وزیر اعظم چوہدری محمد علی اس ملک میں نوکر شاہی کا عروج چاہتے ہیں۔ وہ ون یونٹ بنانا چاہتے تھے۔ تین سال کے بعد انہوں نے جمہوریت کا قلع قمع کیا اور رہا سہا جو بھی جمہوری نظام ملک میں موجود تھا خواجہ ناظم الدین کا تختہ الٹ کر اس کا صفایا کر دیا۔ مگر اس وقت تک چونکہ وہ نوکر شاہی کو ہمارے سروں پر مسلط کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے انہوں نے دستور ساز اسمبلی کو تڑوا دیا۔ سنتے ہیں کہ ایک ہی بار انہوں نے جمہوریت نوازی کا رویہ اختیار کیا یعنی ایک برس پہلے کابینہ کے اجلاس میں جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ جمہوریت کی جگہ آمریت لے سکتی ہے اور جس قسم کی حکومت قائم ہوگی۔ اس میں ان کو کوئی مقام نہیں ملے گا تو انہوں نے اس اسمبلی کے قیام کا مشورہ دیا۔ جس کے آج ہم اور آپ دونوں

الفتح

ممبر ہیں۔ اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

ہاں تو میں یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وزیرِ اعظم اگر کسی بات کا ارادہ کر لیں تو اسے پائے تکمیل تک پہنچا سکتے ہیں۔ اگر وزیر اعظم اس ملک میں سچی جمہوریت لانے کے متمنی ہوتے تو وہ اپنے ساتھیوں سے جو ایک غیر اسلامی اور غیر جمہوری دستور بنانے پر مُصر تھے۔ یہ کہہ سکتے تھے کہ "میں تو سچی جمہوریت ہی لاؤں گا اور اگر تم نہیں مانتے تو میں مستعفی ہو جاؤں گا" جنابِ والا! آپ انصاف پسند آدمی ہیں۔ میں آپ ہی سے پوچھنا چاہتا ہوں اگر وہ ایسا کرتے تو قوم کا کیا ردِ عمل ہوتا میں تو سمجھتا ہوں بنگال اور پنجاب، مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کا بچّہ بچّہ ان کی حمایت کرتا، ان کے پیچھے لگ لیتا اور ملک کو ایک لیڈر مل جاتا جس کی کمی قائدِ اعظم اور لیاقت علی خان کے بعد آج تک پوری نہیں ہوئی۔ اگر وہ اس راہ پر چلتے تو ملک کی ایک گرانقدر خدمت سرانجام دینے کے لیے پوری قوم میں نئے سرے سے جمہوریت کی روح پھونک دیتے۔

عالی جناب!

ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ وزیر اعظم کا ایک بیان پڑھ کر مارے شرمندگی کے میں سر نہیں اٹھا سکا۔ بُرا ہو میری علالت کا کہ اس وقت میں بولنے کے قابل نہیں تھا۔ وزیر اعظم صاحب نے اس وقت غیر ملکی اخبار نویسوں سے کہا تھا کہ "دیکھئے نا صاحب! ہندوستان میں ابھی صوبہ بندی کمیشن نے صوبوں کی حدود میں معمولی ردّو بدل کی تجویز کی ہے اور وہاں بلوے شروع ہو گئے، مگر اس کے مقابلہ میں میں نے نو وحدتوں کو ایک وحدت میں مدغم کر دیا۔ اور اس کے خلاف ایک آواز بھی نہیں اٹھی"۔

یہ بات انہوں نے بڑے فخر سے کہی تھی۔ مگر انہوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ میں نے ضرور اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ مجھے شرمندگی کا احساس اس لیے ہوا تھا کہ یہ وہی ملک ہے جس کے لوگ جنگِ آزادی کے دوران میں شہنشاہیت کو سیفٹی ایکٹ کو ہم معنی سمجھتے تھے۔ مگر انہی لوگوں نے ون یونٹ کی مخالفت نہیں کی۔ ۱۹۵۰ء میں جب سیفٹی ایکٹ منظور کیا گیا تب بھی یہ مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے جب کہ پانچ سال تک ملک کے جمہوریت پسند عناصر جو خاصے کمزور تھے براہِ راست انتخابات کرانے اور جلد سے جلد دستور مکمل کرنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے تھے ان لوگوں نے ان کی آواز میں آواز نہیں ملائی اور چپ سادھے رہے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جب وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو ان پر مکمل اعتماد ظاہر کرنے کے تیسرے روز بیک بینی دو گوش چلتا کیا گیا تو ان کے منہ سے آواز تک نہیں نکلی۔

اسپیکر :- براہ مہربانی تکرار اور طولِ کلام کی بجائے اختصار سے کام لیجئے۔

میاں افتخار الدین :- جنابِ والا! میں اپنی باتیں دُہرا نہیں رہا ہوں۔ میں پانچ منٹ میں اپنی تقریر ختم کر دوں گا۔ مہربانی کر کے آپ مجھے تنبیہہ نہ فرمائیے۔

جنابِ والا!

یہ وہی لوگ ہیں کہ جب پرانی دستور ساز اسمبلی توڑ کر آمریت قائم کی گئی تھی تب بھی انہوں نے ایک لفظ زبان سے نہیں نکالا تھا۔ جنابِ والا! وہ لوگ جنہوں نے دستور ساز اسمبلی توڑنے اور وزیرِ اعظم کو نکالنے پر صاحبانِ اقتدار کو مبارکباد دی تھی اور احتجاج نہیں کیا تھا۔ ہمارے لیے وہ کلنک کا ٹیکہ ہیں۔

آپ کا کام کپڑے کے کارخانوں کی تعداد بڑھانا نہیں نہ فوری طور پر فولاد سازی کی صنعت قائم کرنا ہے۔ آپ کا فرضِ اولین تو قوم میں نئی جان ڈالنی ہے۔ کیونکہ آج بھی ہمارے جمہور میں جمہوری روح دوڑ رہی ہے۔ اصل میں وزیر اعظم کے کرنے کا کام یہ ہے اور یہ کام وہ دو تین ماہ پہلے یوں انجام دے سکتے تھے کہ اپنے اردگرد جمع ہونے والے خود غرض زمینداروں، سرمایہ داروں اور پرانے مسلم لیگیوں کو مخاطب

بنگالیوں کے خلاف مسلم لیگی رہنماؤں کا پروپیگنڈہ خطرناک ثابت ہوگا

کر کے کہتے:

"دیکھو صاحبو! آپ کو جمہوریت کے خلاف کچھ نہیں کرنا چاہیئے۔ اور اگر آپ اپنی ہٹ نہیں چھوڑیں گے تو میں استعفیٰ دے دوں گا۔"

اگر وہ ایسا کرتے تو ملک کی بہت بڑی خدمت سرانجام دی ہوتی۔ بجائے اس کے کہ وہ نوکر شاہی کے بل بوتے پر ایک سرکاری افسر کی طرح حکومت کریں اور کارخانوں میں دو تین کے اضافے کا سبب ہوں۔

جنابِ والا!

وزیر اعظم یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اور ان کے رفقائے کار ہی حق و صداقت کے اجارہ دار ہیں۔ میں عرض کروں کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وزیر اعظم پچھلے آٹھ برس کی مسلم لیگ کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو خود ان کو پتہ چل جائے گا۔ اس نے جو پالیسیاں اختیار کی تھیں وہ کس قدر غلط تھیں اور ان سے عوام کو بہت نقصان پہنچا۔ آج یہ ایوان فیصلہ کر رہا ہے کہ اس دستور میں اس وقت تک کوئی ترمیم نہیں کی جا سکتی جب تک حاضر ممبروں میں سے دو تہائی اس کے حق میں رائے نہ دیں۔ اس بارے میں میں وزیر اعظم سے ایک درخواست کرتا ہوں۔ میں وزیر اعظم کے سامنے ایک تجویز پیش کرتا ہوں۔ جنابِ والا! میں نے مان لیا کہ یہ ایوان پوری طرح نمائندہ ہے اور اس کے خلاف اب میں کچھ نہیں کہوں گا۔ لیکن جناب میں آپ سے تو یہ عرض کر سکتا ہوں کہ موجودہ ایوان ہی کو لے لیجئے۔ اس کے نصف سے زائد ممبروں نے اس دستور کے خلاف رائے دی ہے۔ اور یہ ایک اہم نکتہ ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کی وضاحت کر دوں!

جنابِ والا! اگر آپ غور فرمائیں تو واضح ہو جائے گا کہ اس ایوان میں چند ایسے رکن بھی موجود ہیں جو منتخب نہیں ہوئے۔ میں پورے احترام سے ان ممبروں کا نام لوں گا۔ جو قبائلی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور جہاں عوامی نمائندگی کا کوئی طریقہ رائج نہیں۔ میں عرض کروں گا کہ یہ حضرات کتنے ہی معقول اور اہم کیوں نہ ہوں اور ان کی عملداری کو خواہ بے چون و چرا ہی کیوں نہ تسلیم کیا جاتا ہو پھر بھی ..!

اسپیکر :- آپ اس ایوان کی توہین کر رہے ہیں۔

جنابِ والا! میں ایک آخری نکتہ اور عرض کرنا چاہتا ہوں میں علمائے کرام سے عرض کرتا ہوں کہ خدارا جمہوریت کا گلا مت گھونٹیے ! ——— اور عوام کو جمہوری حق استعمال کرنے کا موقع دیجئے۔ اگر وہ آپ پر بھروسہ کرتے ہیں تو آپ کو ضرور کامیاب بنائیں گے۔ ہر قریہ کی مسجد پر آپ کا قبضہ ہے اور عربی مدرسوں کے مدرسین آپ کے سیاسی کارکن ہیں پھر آپ کیوں ڈرتے ہیں۔ لوگوں کے پاس جائیے ان کو اپنا ہم نوا بنائیے اور انتخابات جیتئے۔ خدا کے واسطے پاکستان میں بحالیٔ جمہوریت کی راہ تو نہ کاٹیے۔ اقتصادی اور معاشرتی نظام کا فیصلہ جمہوری انداز میں اس ملک کے جمہور کی رائے سے کرنے دیجئے نہ کہ نوکر شاہی کے جوڑ توڑ اور سازشوں کے ذریعے۔

آخر میں میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وزیرِ اعظم نے عوام کو یہ حق نہ دلایا (اور مجھے معلوم ہے کہ ایسا ہرگز نہیں کیا جائے گا) تو جہاں ایک طرف یہ ایوان اس غیر جمہوری اور غیر اسلامی دستور کی منظوری پر بغلیں بجا رہا ہوگا۔ وہیں عوام اسے اپنے اس جذبۂ آزادی کے لیے ایک چیلنج سمجھیں گے جس جذبہ کے تحت انہوں نے پاکستان بنایا تھا۔

یہ کہہ کر میاں صاحب اسمبلی سے احتجاجاً باہر چلے گئے

مارکسی علم و عمل کے عظیم رہنما لینن کی ۱۰۳ سالگرہ ۲۲ اپریل ۱۹۷۳ء کو منائی جارہی ہے۔ اس موقع پر ہم لینن کے دست راست اور قریبی ساتھی کامریڈ اسٹالن کا تحریر کردہ مضمون "عظیم لینن" شائع کررہے ہیں۔ کامریڈ اسٹالن نے اپنے مضمون میں لینن کی زندگی، نظریات اور عمل کے بارے میں بعض اہم باتوں کا انکشاف کیا ہے۔ جن سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ (ادارہ)



عظیم لینن

اسٹالن

لینن سے میری واقفیت کا آغاز ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ بلاشبہ یہ واقفیت ذاتی نہ تھی بلکہ بذریعہ خط و کتابت تھی۔ لیکن اس شناسائی نے مجھ پر ایک ایسا انمٹ نقش چھوڑا جو پارٹی میں میرے تمام تر کام کے دوران محو نہ ہوسکا۔ اس زمانے میں میں سائبیریا میں جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ گزشتہ صدی کے آخری عشرے کے اختتام اور بالخصوص ۱۹۰۱ء کے بعد یعنی اسکرا کے منظرِ عام پر آنے کے بعد جب میں لینن کی انقلابی سرگرمیوں سے واقف ہوچکا تھا، تو میں نے محسوس کیا کہ لینن ایک غیر معمولی شخصیت کے حامل تھے۔ میری نگاہ میں پارٹی کے وہ محض رہنما ہی نہیں تھے بلکہ اس کے حقیقی بانی بھی تھے اس لئے کہ صرف وہی ہماری پارٹی کی خلقی ماہیت اور اس کے فوری تقاضوں سے واقف تھے۔ جب بھی میں نے ان کا مقابلہ اپنی پارٹی کے دوسرے رہنماؤں سے کیا تو میں نے سوچا کہ لینن کے ساتھی پلیخانوف، مارتوف، ایکسیلرود اور دوسروں کے مقابلے میں لینن کی شخصیت بہت قدآور تھی۔ اور یہ کہ ان کے مقابلے میں لینن نہ صرف ایک رہنما بلکہ ایک اعلیٰ درجے کے رہنما گویا ایک شاہین تھے، جنہیں رزم آرائی میں کوئی خوف محسوس نہ ہوتا تھا، جو روسی انقلاب کی تحریک کے اَن دیکھے راستے پر پارٹی کی جرأت مندانہ انداز میں رہنمائی کیا کرتے۔ یہ تاثر مجھ پر اتنا گہرا تھا کہ مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ لینن کے بارے میں اپنے ایک قریبی دوست کو خط لکھوں جو اس وقت تارکِ وطن تھے، اور اس معاملے میں انکے خیالات معلوم کروں۔ کچھ عرصے بعد جب میں ابھی سائبیریا ہی میں جلاوطن تھا، ۱۹۰۳ء کے اواخر میں، تو میرے دوست کی جانب سے مجھے ایک پُرجوش اور اسی کے ساتھ لینن کا ایک سیدھے سادے لفظوں میں لکھا ہوا انتہائی دلچسپ خط موصول ہوا۔ یہ پتہ چلا کہ میرے دوست نے انھیں میرے خط کے بارے میں بتا دیا تھا۔ لینن کا خط نسبتاً مختصر تھا، لیکن اس میں انہوں نے جرأت مندی اور بے خوفی سے ہماری پارٹی کی عملی سرگرمی پر تنقید کی تھی۔ اور انتہائی واضح اور جامع انداز میں مستقبل قریب کے لئے پارٹی کے لائحہ عمل کا خاکہ پیش کیا تھا۔ یہ صرف لینن ہی تھے جو انتہائی پیچیدہ مسائل کے بارے میں اتنے سادہ اور واضح انداز میں اس قدر جرأت مندی اور اس قدر اختصار سے اظہارِ خیال کر سکتے تھے، اس طرح کہ ہر جملہ بولتا ہوا نہیں بلکہ چیختا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ اس تصنع سے عاری اور پُرجوش خط کو پڑھ کر میرا احساس مزید پختہ ہوگیا کہ لینن کی ذات میں ہماری پارٹی کو ایک شاہین مل گیا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس امر کے لئے معاف نہیں کرسکتا کہ لینن کا یہ خط میں نے اور بہت سے دوسرے خطوط کی طرح جلا دیا۔۔۔ یہ ایک عادت تھی جو میں نے روپوشی کے دوران سرگرمی کے برسوں کے دوران ڈالی تھی۔

یوں میں لینن سے آشنا ہوا۔

انکار

لینن سے میری پہلی ملاقات دسمبر ۱۹۰۳ء میں تامیرفورس (فن لینڈ) میں بالشیوکوں کی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ میں اپنی پارٹی کے شاہین سے ملنے کا مشتاق تھا۔ میرے ذہن میں لینن کا تصور یہ تھا کہ وہ ایک قوی الجثہ مضبوط اور نمائندہ شخصیت کے حامل ہوں گے۔ اس لمحے میری مایوسی کا تصور کیجئے جب میں نے ایک عام آدمی کو پایا، جس کا قد درمیانے سے بھی کم تھا اور جو دوسرے انسانوں سے رتی برابر مختلف نہ تھا ——

بڑے آدمیوں کا معمول ہوتا ہے کہ جلسوں میں دیر سے پہنچتے ہیں، تاکہ حاضرین ان کی آمد کا دھڑکتے دلوں سے انتظار کرسکیں، اور انکی آمد آمد سے قبل سامعین میں سے کچھ لوگ دوسروں کو تنبیہہ کرسکیں!

"شش۔۔۔ چپ رہو۔۔۔ وہ آرہے ہیں۔"

میں اس رسم کو بے محل نہ سمجھتا تھا۔ اس لئے کہ اس سے لوگ مرعوب ہوتے ہیں اور ان میں احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور مجھے یہ معلوم کرکے سخت مایوسی ہوئی کہ لینن دوسرے مندوبین سے پہلے پہنچ چکے ہیں، اور ایک کونے

میں بیٹھے کانفرنس کے انتہائی عام مندوبین سے ایک بے تکلفانہ بات چیت، انتہائی عام قسم کی بات چیت میں مصروف ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے یہ بات ایسی محسوس ہوئی جیسے بعض ضابطوں کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

یہ بات تو کہیں بہت عرصے بعد جا کر مجھ پر کھلی کہ یہ سادگی اور انکساری، لوگوں کی نظروں میں آنے سے دور رہنے کی کوشش، یا کم از کم اپنے آپ کو نمایاں ظاہر نہ کرنے اور اعلیٰ مرتبہ کو گھٹا کر دیکھنے کی کوشش لینن کی ان انتہائی ممتاز خصوصیتوں میں سے ایک تھی، جو ان میں نئے عوام کے نئے رہنما کی حیثیت سے موجود تھیں۔

وہ شکست سے آزردہ دل نہیں ہوتے تھے

لینن سے میری دوسری ملاقات ۱۹۰۶ء میں اسٹاک ہوم پارٹی کانگریس میں ہوئی۔ جیسا کہ لوگ جانتے ہیں بالشیوک اس کانگریس میں اقلیت میں تھے انہیں وہاں شکست ہوئی۔ ایک شکست خوردہ فریق کے رول میں لینن کی شخصیت کا یہ پہلا تاثر تھا جو انہوں نے مجھ پر چھوڑا۔ وہ کسی طرح بھی ان رہنماؤں جیسے نہیں لگتے تھے جو شکست پر منہ بسورتے ہیں، اور ہمت ہار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس شکست نے انہیں توانائی بخشی اور اس توانائی نے ان کے پیروکاروں کو مستقبل کی فتح کے حصول کے لئے لڑنے کا حوصلہ بخشا۔ میں نے لینن کی شکست کی بات کی ہے، یہ شکست کس قسم کی تھی؟ کاش آپ نے لینن کے مخالفین کو دیکھا ہوتا جو اسٹاک ہوم میں فاتح رہے۔ پلیخانوف، ایکسل رود، مار توف اور دوسرے، یہ سب فاتح کسی طرح نہیں لگ رہے تھے۔ اس لئے کہ لینن نے مین شیوازم پر بے رحمانہ تنقید کے دوران ان کی تکہ بوٹی کر کے رکھ دی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ کس طرح ہم بالشیوک مندوبین ایک جگہ جمع ہو کر لینن کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے اور اس سے مشورے کے طلب گار تھے۔ بعض مندوبین کی تقاریر میں تکان اور مایوسی کی علامتیں نمایاں تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ لینن نے کس طرح دانت بھینچ کر جواب میں سختی سے کہا تھا۔

"منہ نہ بسورو، کامریڈو، ہم جیت کر رہیں گے، اس لئے کہ ہم حق پر ہیں"

مایوسی کا شکار ہونے والے دانشوروں کیلئے نفرت اور فتح پر اعتماد اور ایقان یہ وہ باتیں تھیں جن کے بارے میں لینن نے ہمیں بتایا۔ ہمیں محسوس ہوا کہ بالشیوکوں کو بہت قریبی مستقبل میں فتح مند ہونا تھا۔

"ہار جاؤ تو اس کا رونا نہ روؤ"

منہ مت بسورو کامریڈو، ہم جیت کر رہیں گے

لینن کے کام کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی، جس کی بدولت وہ اپنے گرد ایک انتہائی وفادار فوج کو اکٹھا کر سکے، ایسی فوج کو، جسے اپنی طاقت پر پورا عرفان تھا۔

۱۹۰۷ء میں لندن کے مقام پر منعقد ہونے والی اگلی کانگریس میں بالشیوک جیت گئے اور میں نے پہلی بار لینن کو ایک فاتح کے رول میں دیکھا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ فتح کے نشہ میں بہت سے لیڈروں کا دماغ پھر جاتا ہے۔ فتح انہیں متکبر اور انانیت پرست بنا دیتی ہے۔ عام طور پر لوگ اپنے آپ کو فتح مند محسوس کرتے ہوئے اپنی اس فتح ہی پر قانع ہونے لگتے ہیں۔ لیکن لینن ایسے لیڈروں میں سے کسی طرح سے بھی نہ تھے۔ اس کے برعکس فتح کے بعد وہ دوگنا مستعد اور چوکنا ہو جایا کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ لینن مندوبین کو مستقلاً بتلاتے رہتے۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ آدمی فتح کے نشہ میں چور نہ ہو جائے اور گھمنڈ نہ کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فتح کو مستحکم تر کرے اور تیسرے یہ کہ دشمن کو پورے طور سے مٹا ڈالے، اس لئے کہ اسے شکست ضرور ہوئی ہے لیکن وہ پورے طور پر مٹا نہیں ہے"

انہوں نے ان مندوبین کا چبھتے ہوئے انداز میں مذاق اڑایا، جو رواداری میں یہ یقین دہانی کر رہے تھے کہ،

"من شیوکوں کا کام بس تمام ہو چکا ہے"

انہوں نے یہ بات با آسانی ثابت کر دی کہ مزدور طبقے کی تحریک میں من شیوکوں کی جڑیں اب تک باقی ہیں، کہ ان سے باصلاحیت طور پر نپٹا جائے اور یہ کہ ہمیں کسی طور پر بھی اپنی قوت کو بڑھا کر اور مخالف کی قوت کو گھٹا کر نہیں دیکھنا چاہئے۔

لینن کی یہ اہم خصوصیت تھی جس کی بدولت وہ مخالف کی قوت کا سنجیدگی سے اندازہ کر سکتے تھے اور اچانک رونما ہونے والے حادثات کے خلاف پارٹی کا تحفظ کر سکتے تھے۔

عوام الناس پر بھروسہ

(سیاسی) جماعتوں کے وہ نظریہ داں اور رہنما جو تاریخ اقوام سے واقف ہیں اور جنہوں نے انقلابات کی تاریخ کا مبسوط مطالعہ کیا ہے، بعض اوقات ایک خراب مرض کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ مرض عوام سے خوف محسوس کرنے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں پر عدم اعتماد کا مرض کہلاتا ہے۔ اس مرض کے نتیجہ میں لیڈروں میں اکثر عوام الناس کے مقابلے میں اپنے آپ کو بلند اور بدتر محسوس کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ ان عوام کے مقابلے میں جو انقلابات کی تاریخ کے بارے میں یکسر نہیں جانتے۔ تاہم جن کے مقدر میں پرانے کو توڑنا اور نئے کو تعمیر کرنا لکھا ہے۔ یہ خوف کہ عناصر اربعہ قابو سے باہر ہو سکتے ہیں، کہ عوام الناس ضرورت سے زیادہ توڑ پھوڑ کر سکتے ہیں، اور یہ خواہش کہ ایک ایسی ماں کا کردار کیا جائے جو عوام کو کتابوں کے ذریعہ تعلیم دینے کے لئے تو کوشاں ہو لیکن عوام سے سیکھنے پر تیار نہ ہو۔ یہ ہیں وہ عوامل جو اس قسم کی اشرافیت میں پس پشت کارفرما رہتے ہیں۔

لینن اس قسم کے رہنماؤں کی بالکل ضد تھے۔ میں کسی اور انقلابی سے واقف نہیں ہوں، جسے پرولتاریہ کی تخلیقی قوت اور اس کی طبقاتی جبلت کی انقلابی موزونیت پر اتنا اعتماد رہا ہو جتنا لینن کو تھا۔ میں کسی انقلابی سے واقف نہیں ہوں جو "انقلاب کے مزاج" اور "عوام الناس کے من مانے اقدام سے پیدا ہونے والی گڑبڑ کے بھونڈے نقادوں پر یقین کی سی بے رحمی سے تنقید کر سکتا ہو۔ مجھے یاد ہے کہ اس قسم کی ایک گفتگو کے دوران لینن نے اس ریمارک کے جواب میں کہ انقلاب کے بعد ایک نارمل نظام قائم ہونا چاہیئے"۔ بڑے چبھتے ہوئے لہجہ میں کہا تھا۔

"یہ بڑی بدنصیبی کی بات ہے کہ انقلابی بننے کے خواہشمند لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ تاریخ میں سب سے زیادہ نارمل نظم انقلاب کا نظم ہے"

یہی وجہ ہے کہ لینن ان تمام لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ جو عوام کے بارے میں متکبرانہ رویہ اختیار کرتے اور انہیں کتابوں کے ذریعہ سبق دینے کی کوشش کرتے۔ یہی بات لینن کے اس مقولے کا سبب ہے کہ: عوام سے سیکھو، ان کے اقدامات کو سمجھو اور عوام الناس کی جدوجہد کے عملی تجربہ کا تندہی سے مطالعہ کرو۔

عوام الناس کی تخلیقیت پر اعتماد لینن کی سرگرمی کا وہ خصوصی وصف تھا جس نے انہیں حالات کی صحیح تعبیر کرنے اور انہیں پرولتاری انقلاب کے دھارے میں سمونے کے قابل بنایا۔

وہ انقلاب کے جینئس تھے

لینن نے انقلاب کے لئے جنم لیا تھا۔ وہ بلاشبہ انقلابی

باقی صفحہ ۳۴ پر ملاحظہ فرمائیں

"پاکستان میں دو افراد کی حکومت ہے" ایوب خان صفحہ ۱۴ سے آگے

گروپ پہلے ہی ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر چکا تھا۔ وہ حکومت کی خارجی پالیسی سے مطمئن نہیں ہے۔ بعض افسروں کو ترقی دینے کے لئے جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا وہ اس سے خوش نہیں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ جنرل ایوب کی میعاد جنوری ۱۹۵۹ء میں ختم ہونے والی تھی لیکن مرزا نے اس میں مزید دو سال کی توسیع کر دی تھی کیونکہ وہ کمانڈر انچیف کی حمایت سے اپنی پوزیشن برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ جنرل ایوب خان کھوڑو جیسے بدنام شخص کے ماتحت کام کرنے پر صرف اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کام کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ عوام کی نظروں میں مرزا کا وقار ختم ہو چکا تھا۔ یہ فطری بات تھی کہ فوجی افسروں کا ایک طبقہ اور سیاست دان دونوں سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ خان قیوم کا ۱۹۵۱ء میں بھی فوجی افسروں کے ایک طبقہ سے رابطہ تھا جب ایبٹ آباد کے ایک کرائے کے ایجنٹ نے وزیراعظم کو قتل کیا تھا۔ ایک بار پھر ایبٹ آباد صدر اور کمانڈر انچیف کے خلاف سازشوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ ایوب خان نے اس بات کی گواہی دی ہے کہ قیوم خان نے خون خرابہ کی دھمکی دی تھی۔ فطرتاً یہ بات ایوب خان اور ان کے ساتھیوں کے مفاد میں تھی کہ مرزا سے چھٹکارا حاصل کیا جائے، ایڈمنسٹریشن سنبھال کر انتخابات ملتوی کر دیئے جائیں۔

ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مرکزی مسلم لیگ کی حکومت بننے کی صورت میں ممکن ہے پاکستان امریکہ کے ساتھ اپنے فوجی معاہدے منسوخ کر دے۔ ابتدائی مراحل میں اسکندر مرزا امریکہ کے چہیتے بن گئے تھے۔ ان رشتوں کو مستحکم کرنے کے پیش نظر انہوں نے اپنے لڑکے کو کراچی میں متعینہ امریکی سفیر ہوریس اے ہلڈریتھ کی لڑکی سے شادی کرنے اور امریکی شہریت اختیار کرنے کی اجازت دیدی تھی۔ تاہم اپنے ملک میں ان کا وقار جاتا رہا تھا۔ اب یہ بات امریکہ کے مفاد میں تھی کہ پاکستان پر ایک مرد آہن حکومت کرے۔

ایوب خان کی ڈائری میں ایک اور اہم نوٹ بھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

شام کو (۸ مئی ۱۹۵۸ء) میں نے ایلن ڈلس سے ملاقات کی (جو قبل ازیں ستمبر ۱۹۵۶ء میں جکارتہ جاتے ہوئے ایوب اور مرزا سے ملاقات کی تھی ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو امریکہ کے دو نائب سکریٹریوں ڈڈلی شارپ اور پرکنس میکائر نے امریکی سفیر ہلڈریتھ کے ہمراہ مرزا سے ملاقات کی۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۷ء کو نیوز ویک نے خبر دی کہ امریکی بحریہ کے ماہرین بحر ہند میں ایک چھوٹا امریکی بیڑہ بھیجنے پر زور دے رہے ہیں۔) اور ان کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اپنے بھائی کو جو امریکہ کے وزیر خارجہ تھے، ہمارے مسائل سے متعلق سامنے لائے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایوب خان کا امریکی سی آئی اے کے سربراہ ایلن ڈلس سے قریبی رابطہ تھا جس کے ایجنٹوں نے ۱۹۵۰ء میں ایران میں ڈاکٹر مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا اور ۱۹۵۶ء میں انڈونیشیا میں متشدد بغاوت کے لئے مسلم مسجومی پارٹی کو تیار کیا تھا۔ ایوب خان، جن کے اپنے سیاسی عزائم تھے اپنے ملک میں فوجی انقلاب برپا کرنے سے تقریباً چھ ماہ پہلے ڈلس کے قابل اعتماد حلقے میں شامل ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک تیر سے دو شکار کئے۔ انہوں نے برطانیہ نواز صدر اسکندر مرزا کا تختہ الٹ کر اور فوج و ملک کی سیاسی زندگی میں مغرب کے مخالفین کو کچل کر ایک طرف اپنے مفادات حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ امریکی مفادات کی بھی خدمت کی۔

رش بروک نے اپنی کتاب "دی اسٹیٹ آف پاکستان" میں انکشاف کیا ہے کہ ایک عرصہ سے ہائی کمان ملک کی صورتحال کے بارے میں شدید بے چین تھی۔ اپنے ایکروٹنگ افسروں کے ذریعے دیہات میں پائے جانے والے احساسات و جذبات سے وہ قریبی رابطے میں تھی۔ ہائی کمان کو معلوم تھا کہ زمینداروں کے ظلم اور تشدد کے خلاف کسانوں کی عنقریب ہولناک بغاوت پھوٹ پڑے گی۔ ہائی کمان نے یہ بھی محسوس کیا کہ پوری سیاسی زندگی رشوت و بدعنوانیوں کا ملغوبہ ہے۔ انتظامیہ معطل ہونے کے کنارے پر پہنچ گئی ہے۔ وہ مزید رقمطراز ہیں کہ۔ فوجی افسروں میں اختلافات پائے جاتے ہیں، کچھ کم سینئر افسر اچانک انقلاب برپا کر کے اقتدار سنبھالنا چاہتے ہیں جس طرح کرنل ناصر اور ان کے گروپ نے مصر میں کیا ہے۔ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ جنرل ایوب خان جب اپنے دوستوں کے ساتھ پہاڑی مقام پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ جہاں وہ چھٹیوں میں شکار پر گئے ہوئے تھے۔ انہیں مذکورہ گروپ کی سازش کا علم ہو گیا اور باتوں ہی باتوں میں انہوں نے سازش کی تفصیلات معلوم کر لیں اگر سازش کامیاب ہونے کی اجازت دی جاتی تو پورے ملک میں خون خرابہ ہوتا اور اس سے کمیونسٹوں کے سوا کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس سازش کی تفصیلات اور اس کے درست ہونے کے ثبوتوں کیساتھ جنرل ایوب خان سیدھے کراچی گئے اور فوری طور پر اسکندر مرزا سے گفتگو کی۔

یہ اس بات کا ایک اور ثبوت ہے کہ اگرچہ حکومت نے فوج میں ۱۹۵۱ء میں مغرب دشمن عناصر کو کچل دیا تھا۔ اس کے باوجود ایک اور گروپ وجود میں آگیا تھا جو پاکستان میں مغرب دشمن حکومت قائم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

۱۱ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسٹیٹسمین نے حسب ذیل رپورٹ شائع کی جو اس کے نمائندے مقیم کراچی پیٹرک سارجنٹ نے روانہ کی تھی۔ "پاکستان میں دو افراد کی حکومت ہے۔ ہم مل کر پالیسی بناتے ہیں اور ان کو عملی جامہ پہنانا میرا کام ہے۔" یہ بات پاکستان کے کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان نے آج تیسرے پہر چائے پارٹی کے دوران بتائی۔

"ہم صدر کے ساتھ بیٹھے تھے جہاں ملکہ الزبتھ اور پرنس فلپ کی دستخط شدہ تصویر لگی ہوئی تھی میں نے دریافت کیا۔ اگر آپ نے اختلاف کیا تو کیا ہو گا۔ ایوب نے برجستہ سختی سے جواب دیا۔ بالآخر ذمہ داری فوج کی ہے ---- صدر نے اس بات سے اتفاق کیا کہ ان کے صدر رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے ---- صدر نے کہا مجھے کوئی قانونی یا آئینی منظوری حاصل نہیں۔ البتہ میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں۔ میں نے ملک کو تباہی سے بچایا ہے جو ایک خونی انقلاب کی صورت میں ہوتی ——

ایوب نے کہا :۔ یہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ملک کتوں کے حوالے ہو رہا ہے اور میں نے صدر سے کہا تھا۔ آپ کارروائی کریں گے یا نہیں۔ تبدیلی لانا آپ کی ذمہ داری ہے۔ اگر آپ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے تو تبدیلی لانے پر مجبور کر دیں گے۔ تبدیلیاں لانے کا اصل فیصلہ صدر ہی نے کیا تھا۔ صدر نے کہا۔ ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے ہیں۔ وہ واحد ہستی ہیں جن سے میری دوستی تھی۔ یہ ایک مشترکہ فیصلہ ہے جس میں پہل میں نے کی ہے۔ اگر کوئی شخص انقلاب لایا ہے تو وہ میں ہوں۔

صدر نے بتایا کہ انقلاب کس طرح لایا گیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ساری کارروائی ایک خفیہ عمل تھا۔ میں نے انقلاب کے فرمان کو خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا اور پھر میں نے اُسے ٹائپ کروایا۔ تین ہفتہ سے فوج پہلے ہی ضروری نقل و حرکت کر رہی تھی لیکن یہ بات بھی خفیہ تھی۔ اس منصوبہ میں صرف چار جنرل اسٹاف آفیسر شامل تھے۔ جنرل ایوب نے لقمہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ منصوبہ کچھ عرصہ پہلے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ صدر کو کرنا تھا کہ اُسے کب عمل جامہ پہنایا جائے۔ صدر نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا کہ اس منصوبہ کو تمام وزراء سے بھی مخفی رکھا گیا تھا جو رات ساڑھے آٹھ بجے پینے پلانے میں مصروف تھے۔ پہلی بار انہیں اس کا اس وقت علم ہوا جب رات ساڑھے دس بجے ایک فرمان کے ذریعے انقلاب کا اعلان کیا گیا۔

ایوب خان نے بتایا کہ اس دن وہ کس طرح بذریعہ ٹرین آرمی جنرل ہیڈ کوارٹر راولپنڈی سے کراچی پہنچے تھے۔ صدر نے منصوبہ کو مقررہ دن سے ایک دن پہلے عمل جامہ پہنانے کا فیصلہ

گیا تھا کیونکہ انہیں منصوبہ کو بے نقاب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ہم دونوں فوری کارروائی کرنے پر رضامند ہو گئے۔ میں جس چیز سے بچنا چاہتا تھا وہ عراق جیسے واقعات تھے جہاں گرم مزاج نوجوان بے قابو ہو کر خون خرابہ کر رہے تھے۔

۱۹ راکتوبر ۱۹۵۸ء کو اسٹیٹسمین میں شائع ہونے والی رپورٹ کے مطابق صدر مرزا مبینہ طور پر اس بات کے خواہشمند ہیں کہ پاکستان میں مارشل لاء دو مہینے سے زیادہ جاری نہ رہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار کچھ سفارتی حکام سے کیا ہے، جنہوں نے ان سے کراچی میں ملاقات کی تھی۔ ان میں سے ایک سفیر کے مطابق جو چند روز سے نئی دہلی میں ہیں جنرل مرزا یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں تبدیلی کے ذریعے جو فوجی حکومت قائم ہوئی ہے اس کے بارے میں بھارت کا کیا ردِ عمل ہے۔

بدھ کے دن مرزا نے نون سے ملاقات کی جنہیں انہوں نے دس دن پہلے وزارت اعظمیٰ سے برطرف کر دیا تھا۔ ملاقات کا یہ موقع ایک عشائیہ میں ملا تھا جو مرزا نے مسٹر اور مسز نون کو لاہور روانگی کے وقت دیا تھا جہاں وہ اپنی لڑکی کی شادی میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکندر مرزا اور ایوب خان ایک دوسرے کا تختہ اُلٹنے کے لئے کسی مناسب موقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔

ایوب خان کے بقول صدر نے بعض اہم مقامات پر فوجی دستوں کی پوزیشن معلوم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے پاک فضائیہ کے ایئر کموڈور رب سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ تین فوجی جنرلوں کو گرفتار کر لیں۔ وہ جنرل یحییٰ خان جنرل شیر بہادر اور حمید تھے۔ ایئر کموڈور نے پس و پیش کیا اور مہلت چاہی اور اپنی گفتگو سے ایوب خان کو مطلع کر دیا۔ اب سینئر افسر ایوب خان سے ملے اور ان سے کہا کہ "آپ کی مشکل یہ ہے کہ آپ اپنے دوست کے پاس جا کر یہ نہیں کہنا چاہتے کہ وہ شروع ہی سے غیر وفادار ہیں۔ لیکن یہ تمہاری دوستی سے کہیں زیادہ اہمیت کی بات ہے۔ ہمارا پُر خلوص مشورہ یہ ہے کہ آپ اس بات کو سمجھیں کہ ہم اسے اپنے ساتھ مزید لے کر نہیں چل سکتے۔

(فرینڈز ناٹ ماسٹرز، صفحہ ۷۳-۷۵)

ایوب نے اب صدر کا تختہ الٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ تین جنرل، جنرل برکی، جنرل اعظم اور جنرل شیخ ان کے پاس گئے اور مرزا کو ایوب خان کا پیغام پہنچایا کہ انہیں افسوس ہے کہ آپ (مرزا) جو کچھ کرتے رہے ہیں، وہ ہوشمندانہ کام نہیں، اور یہ بھی بات بالکل واضح ہے کہ عوام آپ کو پسند نہیں کرتے اور وہ بھی ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار نہیں۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ پاکستان کا مفاد وابستہ ہے اور آپ کو فیصلہ کرنا ہوگا۔

اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تینوں جنرلوں نے انہیں الٹی میٹم دیا کہ اگر وہ فوری طور پر مستعفی نہیں ہوتے تو انہیں گرفتار کر لیا جائے گا۔ اور مجرموں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالورز تھے۔ مرزا نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ آسٹریلیا کے ہائی کمشنر میجر جنرل کاؤتھورن نے اسکندر مرزا کی جان بخشی کے لئے مداخلت کی۔ اسکندر مرزا اپنی اہلیہ کے ہمراہ کوئٹہ لائے گئے اور اگلے دن معزول صدر برطانیہ روانہ ہو گئے۔ (صدر مرزا نے ۲۸ ر اکتوبر کی صبح اعلان کیا کہ انہوں نے صدر کے عہدہ سے سبکدوش ہونے اور تمام اختیارات جنرل ایوب خان کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا ہے)۔

بقیہ اداریہ

پارٹی عہدے الگ اور حکومتی عہدے الگ کئے جائیں۔ حکومت کو پارٹی کا تابع کیا جائے نہ کہ پارٹی کو حکومت کے اشاروں پر ناچنے کے لئے منظم کیا جائے۔

مزدور رہنماؤں، کارکنوں، سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کو فوراً رہا کر دیا جائے۔ جھوٹے مقدمات واپس لئے جائیں اور اعتماد کی فضا بحال کی جائے۔

اخبارات پر سے تمام پابندیاں اٹھالی جائیں اور جو اخبارات ملک کے مفاد کے منافی سرگرمیوں میں ملوث ہوں ان پر عام قوانین کے تحت کارروائی کی جائے۔

ڈی۔ پی۔ آر کا استعمال فوراً بند کیا جائے اور جن افراد کے خلاف ڈی۔ پی۔ آر کے تحت کارروائی کی جا چکی ہے، اُن کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہو تو کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ آئین کی منظوری کے بعد ملک میں اتحاد کی فضا بحال کرنے کی فوری ضرورت ہے۔

حالات کا تقاضا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی ہائی کمان اور بالخصوص صدر بھٹو اپنی پارٹی میں تطہیر کے عمل کو تیز کریں اور بالکل انہی بنیادوں پر نیک نیتی، دیانت اور ایمانداری سے کام کیا جائے جن بنیادوں پر اس پارٹی کی تشکیل عمل میں آئی تھی۔ آئین بنا دینا ایک مشکل کام ضرور تھا لیکن اسکو محض دستاویز کے طور پر سجانے سے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ پیپلز پارٹی کو شاید اب اس سے زیادہ کٹھن آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑے۔ اس کے لئے ذاتی اور اجتماعی محاسبے کی اشد ضرورت ہے۔

بقیہ: عظیم لینن

بھونچالوں کے جینئس اور انقلابی قیادت کے جہاں دیدہ ماہر تھے۔ انہوں نے انقلابی بھونچالوں کے دور میں اپنے آپکو جتنا آزاد اور خوش و خرم محسوس کیا اتنا اور کبھی نہیں کیا۔ اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں ہے کہ لینن ہر انقلابی تلاطم کو یکساں طور پر صحیح گردانتے تھے یا یہ کہ انہوں نے ہمیشہ اور ہر قسم کے حالات میں انقلابی دھماکوں کو صحیح قرار دیا۔

میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لینن میں پیش بینی کی جو اعلیٰ صلاحیت تھی وہ انقلابی ابھاروں کے دوران جتنے واضح اور بھرپور انداز میں نمایاں ہو کر سامنے آتی تھی، اتنی اور کسی زمانے میں نہیں۔ انقلابی کایا پلٹ کے ایام میں وہ ایک بدلے ہوئے شخص ہوتے۔ ایسا شخص جو چیزوں کو ان کے واقع ہونے سے پہلے دیکھ سکتا، جو طبقات کی حرکت اور انقلاب کی راہ میں آنے والے ممکنہ پیچ و خم کے بارے میں پیشین گوئی کر سکتا۔

اس میں اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ پارٹی کے حلقوں میں کہا جاتا تھا کہ ایلیچ انقلاب کی لہروں میں تیرنے کے اتنے ہی ماہر ہیں، جتنی ایک مچھلی پانی میں تیرنے کی۔

یہی لینن کے تدبیری یا نعروں کے حیرت انگیز طور پر واضح ہونے اور ان کے انقلابی افکار کی بے پناہ جرأت مندی کا سبب ہے۔

بقیہ: غلام علی تالپور

چاہتے تو میں آپ سے عاجزانہ طور پر درخواست کرونگا کہ آپ کم از کم ان سرکاری عہدیداروں کے خلاف تحقیقات کرائیں جو اس سازش میں ملوث ہوئے۔ تاکہ وہ آئندہ کے لئے سبق حاصل کر سکیں کہ اگر سیاستدان غیر محتاط اور غیر ذمہ دار ہو جائیں تو سرکاری عہدیداروں کو اس سازش میں ان کا شریکِ کار نہیں بننا چاہیئے۔ انہیں ایک باعزت کردار ادا کرنا چاہیئے۔ اور حق و انصاف کی حمایت کرنی چاہیئے۔ انہیں وزیروں کے چشم و ابرو پر رقص نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں اس کی فکر نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ برخاست ہو جائیں گے۔ پریشان کئے جائیں گے یا ان کا تبادلہ کر دیا جائے گا یا ان کے خلاف انتقامی کارروائی کی جائے گی۔ سب سے بڑی طاقت موجود ہے جو ان کا تحفظ کرے گی۔ میں وزیر اعظم سے دست بستہ یہ درخواست کرتا ہوں۔

حلقۂ قارئینِ "الفتح"

- آپ "الفتح" پڑھتے ہیں
- آپ کے علاقے میں کچھ اور لوگ بھی الفتح پڑھتے ہیں
- آپ آپس میں مِل کر ان موضوعات پر تبادلۂ خیال کرتے ہوں گے۔
- آپ اپنے علاقے کے مسائل پر بھی آپس میں گفتگو کرتے ہونگے، کچھ تجاویز بھی آپکے ذہن میں آتی ہونگی۔
- کیا آپ باقاعدگی سے اپنے اپنے علاقے میں مہینے میں ایک بار یا دو بار نہیں مِل سکتے۔؟ پھر ہمیں لکھیں کہ آپ نے کیا سوچا، کیا بحث کی، کیا تجاویز پیش کیں۔
- اس طرح مختلف علاقوں کے مسائل اور ان پر اپنے ہم خیال دوستوں کی سوچ بھی سامنے آئے گی۔

  ہم پھر سب مل جل کر پورے ملک کے مسائل پر بھی کچھ سوچ سکیں گے اور کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔
- ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ "الفتح" کے مرکز سے کوئی صاحب آپ کے حلقے سے تبادلۂ خیال کرنے کے لئے آپ کی خدمت میں آئیں۔
- آپ کا اس تجویز کے بارے میں کیا خیال ہے؟
- کیا ملک کی سلامتی، عوام کی بہتری، غریب و مفلس عوام کے حقوق کے حصول کیلئے "الفتح" کے قارئین اس طرح ایک ٹھوس اور فعّال کردار انجام نہیں دے سکتے؟
- اپنی سوچ سے مطلع کرنے کے لئے ہمیں لکھیے۔

انچارج حلقۂ قارئین "الفتح"

ہفت روزہ "الفتح"، ۸۷-ڈی، نرسری۔ کمرشیل ایریا کراچی ۲۹- فون: ۴۱۲۲۷۴